مہندر ناتھ کے
بہترین
افسانے
مرتبہ
ریوتی سرن شرما
و
اپیندر ناتھ

Mahinder Nath Ke Behtarin Afsane

Compiled by

Reoti Saran Sharma

&

Upender Nath

Price : - 200/-

RAJAT BOOK HOUSE

36 Chetak Housing Society
(1st Floor) Ahinsa Marg
Sector-9, Rohini-Delhi-85

فہرست مضامین

دیوی سرن شرما

مہندر ناتھ۔ ادب اور ایمان

"تم دیوتا ہو"۔

"نہیں بھا۔ میں تو صرف آدمی بننے کی کوشش کر رہا ہوں"۔

(ایک مکالمہ جو مہندر ناتھ نے خواجہ احمد عباس کی فلم "دھرتی کے لال" میں ادا کیا)

انگریزی ناول نگار ٹامس ہارڈی نے اپنے ناول جیوڈ دی آبسکیور Jude the obscure میں ایک کردار لٹل ٹائم جیوڈ کی تخلیق کی، جو اپنے چھوٹے کاندھوں پر بڑا سر لے کر پیدا ہوا۔ مہندر ناتھ اردو ادب کا لٹل ٹائم جیوڈ تھا۔

ٹامس ہارڈی کے لٹل ٹائم جیوڈ Little time Jude کی طرح وہ اپنے کاندھوں پر ایک بڑا اور سوچنے والا سر لے کر پیدا ہوا۔ اس کے ادب کا مطالعہ یہ آخری اثر چھوڑتا ہے کہ مہندر ناتھ نے ادب میں جنم لیتے ہی سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ اور وہ اس دنیا سے یہی سوچتے سوچتے گیا کہ انسان کو اس کی عزت اور عظمت سمیت، کس طرح زندہ رکھا جائے۔

یہ بات اپنے میں بہت اہم ہے۔ بہت سے ادیب، ادب میں آنے کے بہت عرصہ بعد تک "ذہنی بلوغت" حاصل نہیں کر پاتے۔ لیکن مہندر ناتھ نے ادب میں آتے ہی لوگوں کو چونکا دیا کہ اک نیا ادیب آیا ہے جو تخیل اور فکر دونوں اعتبار سے اُن

بھرنے کی سکت رکھتا ہے اور اپنے ہم عصروں کرشن چندر۔ منٹو۔ بیدی۔ عصمت اور اشک کے ساتھ پنکھ مارکر ان کے ساتھ ساتھ اونچائیوں پر اڑ سکتا ہے۔ ان کی طرح وہ سمت۔ زاویوں ادب وسعتوں سے آشنا ہے۔

اسی زمانے میں یعنی سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد کے زمانے میں، کسی نئے ادیب کے لئے لوگوں کو چونکانا۔ اپنا لوہا منوانا اس لئے آسان نہ تھا کیوں کہ ادب ایک نئی ڈگر پر گامزن تھا۔ محض کہانی لکھنا کافی نہ تھا۔ کرشن چندر۔ منٹو۔ بیدی اور عصمت نے ترقی پسند تحریک کے خدوخال کی لکیریں کھینچ دی تھیں۔ ترقی پسند ادیب اپنے دور کے ہندوستان کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کا احاطہ کر رہے تھے اور اس کے ڈانڈے بین الاقوامی زندگی سے بھی ملا رہے تھے۔ وہ زندگی کے تضاد کو آئینہ دکھا رہے تھے اور اس کے کُھ اور بگڑے خیال کو خیال کی گُنیا سے عیاں کر رہے کہ مہندر ناتھ اپنے تخیّل کا پیراشوٹ لے کر ناپ تول اور سروے کے علاقے کے بیچوں بیچ اترا ہے۔ یہ اس کے پہلے افسانے کو پڑھ کر لوگوں نے تسلیم کر لیا۔ کہ ان کے درمیان، ان کے کام کو وسعت بخشنے والا ایک اور ادیب آدھمکا ہے۔ اور اس نے عمل کے لئے جو جھنڈیاں گاڑھی ہیں وہ صحیح جگہ اور بڑے علاقے میں ہیں۔ افسانہ "حنائی انگلیاں" "آزاد تلازمہ یعنی Free Association کی تکنیک میں لکھا گیا تھا۔ اور اس میں جنسی بے راہ روی سے لے کر بین الاقوامی دھوکہ بازی تک کا ذکر تھا۔ ایک قنوطی کی طرح مہندر ناتھ نے اس میں ہر چیز کو دیا سلائی دکھائی تھی اور لندن میں ہونے والے ہٹلر کے بموں کے دھماکوں کو ہندوستان میں سنوایا تھا۔ یہ کرشن چندر کی سماجی انقلابیت اور منٹو کی بے باکی دونوں لئے ہوئے تھا۔

"پھٹ پھٹ۔ دھم دھم۔ کون آیا۔ بم گرا؟ کہاں؟ لندن میں؟ لیکن آواز یہاں آ رہی ہے۔ کانوں میں انگلیاں ڈال لو۔ حنائی انگلیاں۔ سونے کی قاشیں۔

آزادی۔ لارڈ ایمری کا بیان۔ انڈیا فسٹ۔ کیا کہا؟ خوب کہا۔ تقریر کر رہا ہے۔ چرچل۔ ہم آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم غلامی کو اس دُنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ہم فرانس کو دوبارہ زندہ

کرنا چاہتے ہیں ۔ ہم لڑیں گے ۔ ہر جگہ ۔ زمین پر ۔ خشکی پر ۔ سمندر میں ۔ آسمان پر ۔ ہم سب کو آزاد کرنا چاہتے ہیں ۔ نہیں میں بھول گیا ۔ ہم یورپ کو ہٹلر کے پنجے سے آزاد کرنا چاہتے ہیں ۔ کیا یورپ میں ہندوستان بھی شامل ہے ؟ خوب زور سے تالیاں پیٹو ۔ اختر میاں آزادی مانگتے ہیں ؟ آزادی مانگنے سے نہیں ملتی ۔ کچھ اور مانگو ۔ کیا کہا موت ؟ ابھی لو ۔ اسی وقت لو ۔ چلاؤ ۔ خوب زور سے چلاؤ ۔ ہاں کہو مسجد مندر بن گئی ۔ مندر مسجد بن گیا ۔ وہ دیکھو سامنے بازار بند ہونے لگے ۔ بنئے گھروں میں گھس گئے ۔ لاٹھیاں چلنے لگیں ۔ پتھر برسنے لگے ۔ وہ دیکھو مسجد مندر گیا ۔ مندر مسجد ۔ انڈیا فسٹ مت چلاؤ ۔ آزادی ہٹلر کے بعد ۔ اور موت ؟ ابھی لے لو ۔ اسی وقت ۔ جب جی چاہے"۔ (خدائی انگلیاں)

اس کہانی میں مہندر ناتھ قنوطی ہے ۔ ایک مسخ ، ٹیڑھی میڑھی ۔ غلط اصولوں پر چل رہی دنیا کو سدھارنے یا نئے سرے سے بنانے کا نہیں بلکہ اسے ڈائنامیٹ سے اُڑا دینے کا جذبہ باقی ردعمل ہے ۔ لیکن یہ مہندر ناتھ کی پہلی کہانی ہے ۔ تجربہ نے ۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے ۔ مارکسی فلسفہ کے مطالعہ نے مہندر ناتھ پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ۔ یہ سماج ایک پیچیدہ عمل ہے خود آدمی کی اپنی ذات اور اس کے عمل سے نکلا ہے ۔ چیز کو توڑا جا سکتا ہے مگر آدمی کی دنیا "چیز" نہیں ہے ۔ وہ مکڑی کے منہ سے نکلا لیس اور کوئے کے دہانے سے نکلا ریشم ہے اور یہ مکڑی اور یہ کویا خود آدمی ہے ۔ جب تک آدمی کو نہیں سدھارا جائے گا ، یہ نظام نہیں سدھریگا ۔ اور آدمی کو سدھارنا سب سے زیادہ مشکل ہے ۔ اس کے لئے قدروں کا احساس چاہئے اپنی خوبصورت کہانی "روشنی اور تاریکی" میں مہندر ناتھ نے اس عمل کا پہلا احساس اور تجربہ کیا ۔ کہانی کا ہیرو محبت جسم کی مانگ اور رضامندی کے باوجود ہیروئن کو نہیں چومتا ۔ باہوں میں آنے کے لئے بے تاب کپلا کو باہوں میں لے کر اپنے جذبہ کی تسکین کرنے کے بجائے اسے جانے دیتا ہے ۔

"امانت ۔ امانت ہی ہوتی ہے ۔ اگر کپلا چچی کی امانت ہے تو میری بھی امانت ہے ۔ اس میں خیانت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو کون ذمہ دار ہے شادی کرنے سے تو میں رہا ۔ یہ کپلا بھی جانتی ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی ۔ درمیان میں چچی

حائل ہے۔ چین کی دیوار کی طرح ـــــ اگلنت صدیوں کا تعصب اور جہالت راستہ روکے کھڑی ہے۔ چچی کے پیٹ میں درد ہے۔ اسے امرت دھارا چاہیئے۔ لیکن مجھے امرت دھارا مل رہی ہے، میری روح کو بھی ایذا پہنچ رہی ہے۔ لیکن میرے لئے امرت دھارا امانت ہے۔ پھر بجلی زور سے چمکی۔ اور میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ چچی درد سے کراہ رہی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں باہر نکل گیا۔ اور سیدھا چھت پر چلا گیا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا اور اندھیرے کی لہروں کو اپنے اندر جذب کرنے لگا۔ نیچے والے مکان میں کسی نے بتی جلائی۔ روشنی اور اندھیرا کیا کبھی بالکل گھپ اندھیرا ـــ چاروں طرف اندھیرا نہ ہوگا یا بالکل روشنی ہو جائے۔ چاروں طرف روشنی اور اندھیرا کبھی نہ ہو۔ کہیں نہ ہو؟"

مہندر کی یہ سوچ۔ اندھیرے اجالے کا یہ احساس۔ مہندر ناتھ کا طرۂ امتیاز ہے۔ زندگی اپنی نعمتیں اس کے پاس لے کر آئی۔ لیکن عین وقت پر۔ سوچ اور اقدار کا احساس اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ یہ سوچ اور یہ احساس "اخلاقی" نہیں ہیں۔ یہ خالص انسانی ہیں۔ اور اس باریک بین اور دور بین نگاہ سے پیدا ہوتے ہیں جو سطح پر نہیں رکتی۔ ایکسرے کی ہمتی لہر کی طرح انسان اور معاشرے کے ڈھانچے کی اصل صورت اس کے سامنے لا کھڑی کر دیتی ہے۔ افسانے "برف" میں یہی ہوتا ہے۔ وہ جسم کا بھوکا ہے۔ عورت روٹی کی بھوکی ہے۔ سودا دو روپے میں طے ہوتا ہے۔ عورت بے حیل وحجت اُس کے بستر پر آجاتی ہے۔ رکاوٹ کوئی نہیں ہے۔ مگر وہ عورت کو قبول نہیں کرتا۔ کیوں کہ قدر کا قائل ہے۔

"اس نے گلاب کے لبوں کو چوما۔ گلاب کے لب ٹھنڈے تھے۔ اور اندر کی طرف بھنچے ہوئے تھے۔ یکایک وہ ٹھٹک کر پرے ہوگیا۔

"گلاب" اس نے تھرائی ہوئی مایوس آواز میں کہا۔

"بابو۔" اور گلاب کی آنکھیں جھک گئیں اور گلاب کے لب پھر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

گلاب کے ٹھنڈے لمس نے اس کے ذہن کو بیدار کر دیا۔ گلاب کے شرمیلے احساس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ گلاب بستر پر ننگی لیٹی ہوئی تھی ـــــ جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ مجھے اس کام سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی سروکار نہیں۔ لیکن میں انکار بھی نہیں کرتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کسی کام سے تعلق بھی نہیں واسطہ بھی نہیں اور پھر کسی بات سے انکار بھی نہیں۔ لیکن جس بات نے اس کے ذہن کو بیدار کیا وہ عورت کا سرد لمس تھا۔ کیا عورت کا جسم سرد ہوتا ہے۔ اس نے زندگی میں پہلی بار عورت کو چھوا تھا لیکن کتنا تلخ تجربہ تھا۔ اس کا جسم کیوں انگارے کی طرح جل رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ اس ننگی عورت پر غصہ آیا۔ جس نے اس کے تخیل کو پارہ پارہ کر دیا.... اس کمرے میں اندھیرا کیوں ہے۔ یہ میلے اور بوسیدہ کپڑے کس کے ہیں۔ ان میں سے بدبو کیوں آرہی ہے..... یہ عورت لیٹی کیوں ہے؟ یہ بولتی کیوں نہیں؟.... یہ بستر پر ساکت اور غیر متحرک ہو کر رہ گئی ہے کیا وہ اس عورت کو گھر میں رکھ لے ـــــ ٹرنکوں کی طرح۔ بوتلوں کی طرح۔ چھڑی کی طرح۔ کیا یہ عورت ایک چادر ہے۔ ایک غلاف ہے۔ ایک ٹرنک ہے؟"

عورت چادر یا ٹرنک نہیں ہے۔ یہ جذباتی یا جنسی ردِعمل نہیں ہے۔ یہ فکری عمل ہے جو جو مہندر ناتھ کے ادب میں شروع سے غالب ہے مہندر ناتھ کی زندگی بھی اسی عمل کی تابع تھی۔ وہ ایک اچھے خاندان میں پیدا ہوا۔ قدرت نے اسے مردانہ حُسن سے مالامال کیا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی عشق کی نعمت نصیب ہوئی۔ ایک دولتمند اور شریف خاندان کی خوبصورت لڑکی بملا نے اس سے عشق کیا۔ گھر والے شادی کو تیار تھے پانچ سال رشتہ رہا۔ لیکن مہندر ناتھ نے نہ عشق کی ذمہ داری قبول کی نہ شادی کی۔

روشنی کا مینار

یہ جذباتی فیصلہ نہ تھا۔ یہ مہندر ناتھ اور اس کے ادب، دونوں کے لئے تاریخی فیصلہ تھا۔ مہندر ناتھ عام انسان کی کلرکی کرتا۔ دو وقت روٹی کھانے اور بچے پیدا کرنے کی زندگی

چھوڑکر چلا آیا۔ اور ادب میں روشنی کے منارہ کی تلاش کرنے لگا۔ دراصل روشنی کے منار کی تلاش مہندر ناتھ کی زندگی اور اس کے ادب کا ابتدائی، مرکزی اور آخری نقطہ ہے۔ اسی تلاش کی وجہ اور ضرورت "چاندی کے تار" میں درج ہے۔ یہ افسانہ مہندر ناتھ کا سب سے اہم افسانہ ہے کیونکہ اس میں اس کے ادب کو سمجھنے کی کُنجی ہے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مہندر ناتھ ادب میں سوچتے ہوئے داخل ہوا اور یہ سوچ ایک نیا رنگ لئے تھی۔

"اکثر میں سوچتا ہوں، میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کیوں پریشان ہوں اور دھیرے دھیرے مجھ پر یہ بات عیاں ہونے لگی کہ مجھے کلرکی سے نفرت ہے۔ ان ساٹھ روپوں سے نفرت ہے۔ مجھے انسانوں کی کمینگی سے نفرت ہے۔ کیوں کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ چھتوں پر اندھیرا۔ برتنوں پر اندھیرا۔ چولہوں پر اندھیرا۔ روٹیوں پر اندھیرا۔ دھیرے دھیرے یہ اندھیرا پھیلتا جاتا ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے پر چھاتا جاتا ہے۔ انسان کی رگ رگ میں سماتا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے مجھے اس نظام سے نفرت ہونے لگی۔ جہاں اندھیرا پھیلا رہتا ہے۔ کیوں نہ میں اس اندھیرے کو چیر دوں؟ کیوں نہ اس اندھیرے کے لبادے کو پھاڑ دوں۔ تاکہ روشنی کی صبح پھوٹ پڑے۔ اور ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں بھی روشنی کی ایک آوارہ کرن پہنچ جائے جہاں ایک شوہر، ایک بیوی اور بہت سے بچّے ہوتے ہیں۔ اور کلرکی کے ساٹھ روپے ہوتے ہیں۔ جہاں عورتیں شادی ہوتے ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔" (چاندی کے تار)

"کبھی کبھی تمھاری سنہری آرزوؤں کا جال میرے قریب آجاتا تو میرے صبر کے بند ٹوٹ جاتے اور میں سوچتا کہ مجھے کیا غرض ہے کہ میں اپنے آپ کو یوں برباد کروں۔ ازل سے لے کر ابد تک یہ اندھیرا چھایا ہوا ہے اور آج تک کوئی شخص اس اندھیرے کو دور نہ کر سکا۔ بلکہ یہ اندھیرا دن بہ دن زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں روشنی کے اس مینار کو پانے کی بے سود کوشش کر رہا ہوں۔ کیوں نہ میں اپنے آپ کو اندھیرے کے اس بے پایاں سمندر میں پھینک دوں اور ہمیشہ کے لئے غرق ہو جاؤں۔ اور پھر اس اندھیرے میں تمھارے ہونٹ چمکنے لگتے۔ تمھارے لانبے

لانبے بال، سر سے لے کر پاؤں تک چھا جاتے۔ تمہاری آنکھوں میں سنہری آرزوئیں جھانکنے لگتیں اور میں تمہیں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ تاکہ تمہارے سیاہ بالوں میں اپنے کو چھپا لوں! اور تمہاری آتشیں خواہشیں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں اور ہم دونوں اس اندھیرے سمندر میں باقی لوگوں کی طرح لڑھکتے رہیں ...... لیکن میں نے سگریٹوں کی ایجنسی لے کر شادی کرنا گوارہ نہ کیا۔

شاید مجھے عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرنے کی آرزو نہ ہوئی۔ بلکہ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے اور اس طرز بود و باش سے اس معاشرے سے۔ اس تہذیب و تمدن سے۔ میں روشنی کے مینار کو پانا چاہتا ہوں اور اس کی نورانی کرنوں کو دُنیا میں بکھیرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس پھیلے ہوئے بے پایاں اندھیرے میں کچھ کمی آجائے۔

مہندر ناتھ مادّی تہذیب کے ارتقائی عمل سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سائنسی سماج کو صنعتی سماج کھائے گا۔ سائنسی سماج خود بچھڑا ہوا سماج تھا اور انسان کی پیٹھ پر سوار ہو کر چلنے والا سماج تھا۔ اس کے ہاتھ غریب اور بھولے بھالے انسانوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے خون سے رنگے تھے۔ اس لئے مہندر ناتھ نے اس سے ناطہ توڑ لیا۔ اور نہ کلرکی لی اور نہ محبوبہ اور نہ سگریٹوں کی ایجنسی۔ وہ روشنی کے مینا کی تلاش میں لاہور۔ دلّی، لکھنؤ اور پونا ہوتا ہوا بمبئی پہنچا۔ یہاں سے اسے صنعتی نظام کی برکتیں میسر ہوئیں۔ وہ ہیرو بن گیا۔ "سرائے کے باہر"۔ اور " راکھ" نام کی فلموں میں کام کیا۔ روپے کمائے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے عیش و آرام کی جھلک دیکھی۔ لیکن جلد ہی اس نظام نے اپنا اصلی روپ دکھایا۔ مہندر ناتھ اور اس کے ساتھیوں کو پٹخنی دی۔ فلمیں ناکامیاب ہوئیں۔ جو کمایا تھا وہ بچا کر نہ رکھا۔ بھوک اور بیکاری سامنے آکھڑے ہوئے۔ مہندر ناتھ کے گھر کے کسی فرد نے وہ ذہنی اذیت پہنچائی کہ پاگل ہوتے ہوتے بچا۔ اندھیری سے بھاگ کر ایک مراٹھی لڑکی درگا دیوی کے پاس دادر آیا۔ اس لڑکی میں انسانیت کے گُن تھے۔ مہندر ناتھ اس کے پاس ٹھہر گیا۔

دوسرا دور

لیکن یہ لڑکی غریب تھی، ایک بے پڑھے لکھے خاندان کی تھی۔ ماں باپ بہنیں۔ رشتہ دار

سب غربت کی لعنتوں میں لتھڑے تھے۔ جس بلڈنگ میں آکر رہا (چھپرا بلڈنگ) اس میں بھی غریب لوگ رہتے تھے۔ ان کی معرفت مہندر ناتھ نے صنعتی شہر اور سرمایہ دارانہ نظام کا اصل روپ دیکھا۔ اس کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور شروع ہوا۔

یہ دور پہلے دور سے الگ نہیں ہے۔ یہ صرف اس کی تصدیق اور توسیع ہے۔ پونچھ سے بمبئی تک کے سفر نے مہندر ناتھ کو جو سکھایا وہ عین مین وہی تھا جس کا ادراک اس نے "چاندی کے تار"۔ "دو بیل"۔ "برف"۔ "اکیلا"۔ "حنائی انگلیاں" میں کیا تھا۔ صرف یہاں وہ عمل شدید اور تیز ہو گیا تھا۔ "مجھے خرید لو" میں اس نے ایک باوفا گھریلو بیوی کی آنکھوں میں زندگی کی یک رنگی یا بے رنگی سے بچنے کے لئے "بکنے" کی موہوم سی چمک دیکھی تھی۔ لیکن بمبئی کی صنعتی دُنیا میں اس نے خود کو یا پورے خاندان کو بھوک یا بیماری سے بچانے کے لئے عورت کے خود یا اپنوں کے ہاتھوں بکنے کے عمل میں ایک باقاعدہ "فن" کے روپ میں سُنتے دیکھا۔ "ایک دو تین چار"۔ "زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں"۔ "ایک بار"۔ اور صرف آخری بار"۔ "۵۵۵"۔ "گاڈ بلیس یو"۔ "راز"۔ "جونکیں"۔ "بدلہ"۔ یہ افسانے جسم فروشی کے جنسی افسانے نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں نے انہیں "فلمی سماج" کے افسانے کہا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ دراصل یہ افسانے اس عمل کو دکھاتے ہیں جس سے سائنسی سماج کا آدمی بکھر کر یا لوٹ کر صنعتی سماج میں آتا ہے اور اس کی مشینی بے حسی' معاشی چکی میں پس کر اپنی ساری روایتیں اور قدریں گنوا بیٹھتا ہے۔

نیا ایمان

اس کی شکل سب سے عمدہ اور جامع و مانع اظہار مہندر ناتھ کا ناول "رات اندھیری ہے" ہے۔ اس ناول میں مہندر ناتھ نے پونچھ کے سامنتی سماج کے انسان کو (جو وہ خود ہے) بمبئی کے صنعتی ماحول کے بیچ رکھ کر اس کی اقدار کی توانائیوں کو پرکھا ہے۔ نوجوان جگدیش پونچھ کے قصبے سے چل کر بمبئی آتا ہے اور یہاں کی زندگی میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ اپنی محبوبہ چھوڑ کر آیا ہے اور وعدہ کر آیا ہے کہ اسے جلد از جلد بلالے گا۔ لیکن بمبئی آکر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قابلیت اور نیکی کی کوئی قدر نہیں۔ وہ ایک 'جنس' محض ہے۔ جیسے اس کے جسم کی وجہ سے ایک ایکٹریس رانی پسند کرلیتی ہے۔ ٹکڑوں کے لئے وہ بھی اسے پسند کرلیتا ہے۔ لیکن پوچھ سے اس کی محبوبہ کملا آجاتی ہے۔ تجارتی رشتہ میں گڑبڑ پڑنے لگتی ہے۔ رانی اسے الٹی میٹم دیدیتی ہے کہ اگر وہ اس سے روپے چاہتا ہے تو اسے کملا کو واپس بھیجنا ہوگا۔ سامنتی آدمی صنعتی دور میں جینے کے لئے اپنی سامنتی محبوبہ کو کھڑکی سے گرا کر مار دیتا ہے اور اس محبت کا خاتمہ کر دیتا ہے جو اسے جذباتی غذا تو دے سکتی تھی لیکن جسم کو زندہ رکھنے والے نقرئی سکّے نہیں دے سکتی تھی۔

"محبت کرنا آسان بات ہے۔ بچے پیدا کرنا آسان بات ہے۔ خدمت کرنا آسان بات ہے۔ کسی کا انتظار کرنا آسان بات ہے۔ کھانا پکانا، کپڑے دھونا آسان بات ہے۔ آہیں بھرنا۔ گریہ وزاری کرنا آسان بات ہے۔ لیکن روپے کمانا بہت ہی مشکل ہے۔"

(رات اندھیری ہے)

اسی کی ایک جھلک مہندر ناتھ اپنے پہلے ناول "آدمی اور سکّے" میں دکھا چکا ہے۔ اس ناول میں ایک طرح سے مہندر ناتھ نے اپنے اگلے بڑے ناول کے لئے کھونٹیاں گاڑھی تھیں۔ ماحول بمبئی کا ہے اور انسانی رشتے خالص تجارتی ماحول پیداوار۔ ایک عورت حمیدہ کو ایسے لڑکے سے محبت ہے (محبوب علی) جو اس سے محبت نہیں کرتا۔ لیکن محبوب علی کو اس سے محبت کرنا پڑتی ہے کیوں کہ وہ اس کے ٹکڑوں پر پلتا ہے۔ حمیدہ کو ایسے آدمی سے محبت کرنا پڑتی ہے جو بدصورت ہے لیکن جس کے ٹکڑوں پر وہ پلتی ہے۔ ناول کے ہیرو کو ایسی لڑکی ملتی ہے جو اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لئے پیسہ کماتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ سونے کو تیار رہے لیکن شادی کرنے کو نہیں کیوں کہ وہ اس کے ماں باپ کا پیٹ نہیں پال سکتا۔ اس طرح ہر کردار بکا ہوا اور ٹوٹا ہوا ہے۔

کوئی جذباتی ادیب ہوتا تو صنعتی دور کے خلاف جذباتی بغاوت کر اٹھتا۔ اور پرانے دور کو واپس لانے کی دہائی دیتا۔ لیکن مہندر ناتھ جانتا تھا کہ صنعتی دور آکر ہی رہے گا۔ اور انسانوں کو مہاجنی دور کے مظالم اور افلاس سے چھڑانے کے لئے اسے آنا ہی چاہیئے۔ اس لئے اس نے اس ناول میں ایک نیا کردار شامل کیا۔ رومیش کمیونسٹ کا۔ رومیش صنعتی دور کا مخالف نہیں۔ لیکن اس کی "بدعنوانیوں" کا علاج اشتراکیت میں دیکھتا ہے۔ وہ کمیونزم کے فلسفہ میں ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کے سامنے موجودہ صورت حال سے بچ نکلنے کا راستہ ہے۔

"روس کی طرف دیکھیئے۔ حال میں چین کے انقلاب کو دیکھیئے کہ کس طرح انھوں نے عوام کی کایا پلٹ کر دی۔ بھوکوں اور ننگوں کو کپڑا دیا۔ نوکری دی ملک میں بدمعاشی کو دور کیا۔ اگر روس اور چین اپنے ملک سے بیکاری۔ بدمعاشی۔ عصمت فروشی اور بلیک مارکٹ دور کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟"

رومیش ایک عورت کی محبت حاصل کرنے کے لئے نہیں، اس نظام کو بدلنے کیلئے جدوجہد کرتا ہے جس میں عورت، مرد بدمعاشی کرنے، جسم بیچنے اور محبت سے محروم رہنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ ناول کے آخر میں ناول کا ہیرو محبت میں ناامید ہوکر خودکشی کرنے کے بجائے ایک بہتر نصب العین یعنی مارکسی نظام کے لئے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

لیکن "آدمی اور سکّے" میں اس بہتر نظام کا ذکر سرسری ہے۔ ایک سطحی کا جذباتی لگاؤ اس سے دکھایا گیا ہے۔ مگر "رات اندھیری ہے" میں مہندر ناتھ نے زندگی کا پورا امرت منتھن کیا ہے اور اس زہر کو پوری طرح اجاگر کیا ہے جو زندگی کے ساگر میں رس بس گیا ہے۔ اس نے ناول کے شروع میں چنی لال اور کنول لال کے والد کی سوانح کی معرفت دیہاتوں کی لوٹ کھسوٹ اور وہاں مہاجنی نظام قائم ہونے کا عمل دکھایا ہے۔ جگدیش اور اس کے دوستوں کی معرفت اس جنسی ناآسودگی اور جذباتی گھٹن کا بیان کیا ہے جو ایک پچھڑے روایت پسند سماج میں پیدا ہوتی ہے۔ گو اس نے جگدیش کی ماں، مکلا کی ماں اور چنی لال

کے کرداروں میں ایثار و محبت ۔ خلوص اور داداری جیسی انسانی قدروں کو بھی درشایا ہے ۔ جو سامنتی نظام کی تاریکی میں روشنی کی کرنیں تھیں ۔ جگدیش کو نوکری کی تلاش میں بمبئی بھیج کر اس نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ سامنتی معاشی ڈھانچہ خود کفیل نہیں ہے ۔ اس کے کنارے کی ریت کٹ کر صنعتی سماج کے دھارے میں گرنے کے لئے مجبور ہے ۔ سماج کے اس بہاؤ کو روکا نہیں جا سکتا ۔

جگدیش کو بمبئی لاکر مہندر ناتھ نے بمبئی کے صنعتی سماج کو کھنگالا ہے ۔ نرائن اور اس کے ساتھیوں کی معرفت اس نے سرمایہ داروں کی بے حسی ۔ بے دردی اور معاشی سازش سے پردہ اٹھایا ہے ۔ جیرا کی سالگرہ کا نقشہ اور اسٹوڈیو میں ایکسٹراؤں کا بیان ـــ ایک تجارتی سماج کی بے راہ روی ۔ اوباشی ، شکست خوردگی ۔ بے اطمینانی اور محرومی کا اظہار ہیں ۔

"لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان آزاد ہے ۔ لوگ کہتے ہیں آج کل ہمارا نیشنل انتھم ہے ۔ ہمارا جھنڈا ہے ۔ ہو گا ۔ لیکن ان کو دیکھ کر اور سن کر میری بھوک کم نہیں ہوتی میں نے دیانتداری سے کام ڈھونڈا ۔ لیکن کام مجھے نہیں ملا ۔ ..... میری عمر ۳۶ برس کی ہے لیکن آج تک میں نے کسی عورت کے جسم کو ہاتھ لگا کر نہیں دیکھا ۔ ..... لیکن جنسی بھوک سے زیادہ مجھے پیٹ کی بھوک نے ستایا ۔ اور پیٹ کی بھوک سے زیادہ ذلت کے احساس نے مجھے کہیں کا نہ رہنے دیا ۔ جو مجھے کہتا ہے کہ تم کسی کام کے آدمی نہیں ہو ۔ میں اب بھی کام کرنا چاہتا ہوں ۔ لیکن مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس قسم کی آزادی کے تلے میں ہمیشہ بیکار رہوں گا ـــ یہ چار گز لمبی کھولی ۔ یہ چار گز کی قبر ، جہاں ایک نہیں چار آدمی سوتے ہیں ..... اس میں بیکاری ہے ...... بھوک ہے ...... موت ہے ۔ اس سے نکل بھاگو ـــ یہاں سے نکلو ...... آگے بڑھو ...... یہاں مر جاؤ گے ...... کوئی نہیں پوچھے گا ۔ اس اندھیرے سے نکلو" (رات اندھیری ہے کا کردار ۔ صوفی)

صوفی کی خودکشی کے بعد جگدیش کو ایک فلم ایکٹریس ملتی ہے ۔ جو اسے "مرد طوائف" کے طور پر اپنے پاس رکھتی ہے ۔ اس عورت سے روپے حاصل کرتے رہنے کے لئے وہ اپنی محبوبہ اپنی

بیوی کا قتل کر دیتا ہے۔ جگدیش کا اپنی محبوبہ کملا کو نیچے گرا کر مار دینا زندگی کے تجارتی تقاضوں کی ذہنیت کی معراج ہے۔ یہ تقاضے انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ اس میں کیا تناؤ پیدا کرتے ہیں۔ اس کا ہولناک بیان رات اندھیری ہے کے صفحات پر رقم ہے۔

"لاش ملنے کے بعد جگدیش اور اس کے دوستوں نے کملا کو آگ کے سپرد کر دیا۔ جو کام اسے کرنا تھا اس نے کر ڈالا۔ ..... لیکن اس نے یہ کیا کر ڈالا۔ وہ کیا کرنے اور کیا بننے آیا تھا۔ اور کیا بن گیا؟ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس نے یہ قتل کیسے کر دیا۔ وہ تو صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ کون تھا جس نے ترغیب دی تھی کہ موقع ہے۔ دھکا دیدو۔ اس نے کملا کو مار دیا۔ لیکن وہ مری نہیں ہے وہ زندہ ہے ..... یہ اس کے بال ہیں۔ یہ اس کے ہونٹ۔ یہ اس کا پیٹ۔ یہ اس کی شلوار۔ یہ اس کی ٹانگیں۔ یہ اس کے پاؤں — وہ مری کہاں ہیں۔ وہ مارنے کے بعد بھی زندہ رہے گی۔ ہا ہا ہا۔ ایک شور سنائی دیا جیسے ڈھول پیٹے جا رہے ہوں۔ اور شور بڑھتا چلا آ رہا ہو..... شاید کسی شیر کا شکار کیا جا رہا ہے ڈھول پیٹ کر اور شور مچا کر شیر کو مچان کی طرف لایا جا رہا ہے۔ شیر مجبور ہو کر مچان کی طرف آ رہا ہے۔ شیر مچان کے سامنے آ گیا۔ بندوق کی نال نے اس کی کنپٹی کا نشانہ لیا اور "ٹھائیں" چیخ مار کر جگدیش نے دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ لیا — وہ چیخ کر باہر نکل گیا۔ ..... وہ چلتا گیا ..... چلتا گیا۔ وہ صبح سے چل رہا تھا، اسے کچھ علم نہ تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ کیا کر رہا تھا۔ بس وہ چلا جا رہا تھا۔ دھوپ میں چلا جا رہا تھا۔ چھاؤں میں چلا جا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھے بیٹھے چلا جا رہا تھا۔ بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے چلا جا رہا تھا۔ اور لوگ بھی چلے جا رہے تھے — اور عمارتیں اور سڑکیں بھی چلی جا رہی تھیں۔ آج سب چیزیں چلی جا رہی تھیں — کیوں۔ کس لئے؟ — کہاں کو؟ .....

وہ ہیرا کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے ہیرا کو بتا دیا۔ "میں نے صرف روپے حاصل کرنے کے لئے کملا کو مار دیا۔ ان چند حقیر سکوں کے لئے، جن کا منبعِ اعظم تم ہو۔ ہیرا مجھے تم سے نفرت ہو گئی۔"

"اس دُنیا میں انسان جینے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا۔ میں نے اپنا جسم بیچ دیا۔ اپنا ضمیر بیچ دیا۔ اپنی عزت بیچ دی۔ اور اس کے عوض جو ملا، وہ تمہیں دے دیا۔ آؤ میں تمہیں اپنے سینے

سے لگالوں اور اس نفرت کو چوس لوں جو تمھارے چاند سے چہرے کو گہنائے ہوئے "۔ ہیرا نے اپنی بانہیں جگدیش کی طرف پھیلا دیں۔

جگدیش نے ان بانہوں کی طرف دیکھا۔ ان چھاتیوں کی طرف دیکھا جن کا زیر و بم اسے اپنے اندر مدغم ہونے کی دعوت دے رہا تھا ہیرا اپنے گداز اور خوبصورت جسم کی طاقت آزما رہی تھی۔ لیکن وہ کیا ہے؟ اس نے ایک عورت کا، اپنی محبوبہ کا خون کر دیا اور اب ان بانہوں کو دیکھ رہا ہے۔ ان چھاتیوں کے گداز بھاروں سے محظوظ ہو رہا ہے؟ وہ واقعی انسان نہیں یا اب انسان نہیں رہا۔ یا بنیادی طور پر اس کی انسانی شخصیت میں کوئی خامی آگئی۔ وہ ایک جانور ہے کتے کی طرح۔ اور ہیرا؟ یہ عورت نہیں۔ اس میں ممتا نہیں۔ قربانی کا جذبہ نہیں۔ یہ محض ہوس ہے۔ خالص شہوانیت ہے۔ مجسم حیوانیت ہے۔"

لیکن مہندر ناتھ سماجی ارتقا کے شعور کا احساس رکھتا ہے وہ جانتا ہے۔ صنعتی سماج ارتقا کی اگلی سیڑھی ہے۔ اس لئے وہ اس سماج کے خلاف کچھ نہیں کہتا۔ وہ موجودہ صورت حال کو ارتقائی دور کی عبوری لعنتیں Transition ills مانتا ہے اور گھڑی کی سوئیاں الٹی پھیرنے کے بجائے ان سے نپٹنے کے لئے ایک نئے انسان، ایک نئے فلسفے اور ایک نئے نظام کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔

وہ مزدور نیتا نرائن کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ مارکسی نظامِ حیات پر ایمان لاتا ہے۔ اس نظام کو لانے کی کوشش میں نرائن مارا جاتا ہے لیکن مہندر ناتھ ایک حیات افروز تصور کو پالیتا ہے۔ وہ زندگی۔ زندگی اور موت کا فرق پہچان پاتا ہے — جو بہت بڑا فرق ہے۔ جو روشنی اور تاریکی کا فرق ہے۔ جو اندھیرے میں جیتے چلے جانے اور روشنی کا منارہ پانے کے لئے قدم اٹھانے کا فرق ہے۔

"یہاں اس شہر میں آکر سب مر چکے ہیں۔ وہ گاؤں میں رہتے تو بھی مر جاتے۔ صوفی مر گیا۔ اس نے خودکشی کر لی۔ نرائن مر گیا اس نے پولیس کی گولی کھائی۔ میں بھی مر جاؤں گا۔ سولی پر چڑھ کر۔ لیکن موت۔ موت میں فرق ہوتا ہے۔ نرائن کی موت، میری موت۔ یہ صوفی کی موت سے جدا ہے۔ اعلیٰ ہے۔ عظیم ہے۔ اس کی موت بھگوڑے کی موت نہیں۔ ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے کی موت ہے۔ یہ موت زندگی سے بڑی

بڑی ہوتی ہے کیوں کہ یہ زندگی کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے۔ یہ موت زندگی کو ختم نہیں کرتی۔ اس کی آبیاری کرتی ہے۔" (رات اندھیری ہے)

موت

مہندر ناتھ کے ادب میں موت کا ذکر آتا ہے۔ دراصل جینے کی کوشش میں مہندر ناتھ مرنے سے پہلے بہت بار مرا۔ اس نے بہت سے تجربے کئے۔ اپنے کو طرح طرح کی کٹھائی میں ڈالا کبھی خودکشی کی (سورج۔ ریت اور گناہ) کبھی پھانسی کھائی (رات اندھیری ہے) کبھی تیرتھ اور نرائن جیسے کرداروں کو موت کے تیزاب میں ڈبا کر دیکھا۔ تپ دق میں تو اس کے کردار مرتے ہی رہے۔ مہندر ناتھ خود بھی موت کے کمپلیکس میں گرفتار رہا۔ لیکن بنیادی طور پر مہندر ناتھ زندگی کا ادیب ہے۔ اس کی کہانیوں میں یا ناولوں میں جو کردار مرتے ہیں۔ وہ یا تو معصوم ہیں یا اختلاط پذیر یا پھر اشتراکی۔ وہ انسان یا خدا کے آگے انسان کی بے بسی یا زندگی کی بے ثباتی یا کسی تاریک فلسفہ کے منظر نہیں ہیں۔ وہ اقتصادی اور سیاسی استحصال اور جدوجہد کے عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو زندگی کو موت اور موت کو زندگی میں بدل دیتا ہے۔ مہندر ناتھ موت کو بھی زندگی کی 'آبیاری' کا عمل بنانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے انسان کسی نصبُ العین کے لیے مرے تاکہ مادہ منتشر ہونے پر بھی انسانی سماج کی زندگی پر و تنظیم میں معاون ہو کم ادیب ملیں گے جو زندگی کے ساتھ اتنے بندھے ہیں۔ اس سے اتنی تعمیری محبت کرتے ہیں۔

انسانیت پرستی

مہندر ناتھ بنیادی طور پر انسانیت پرست ادیب تھا۔ اسے انسان سے بہت محبت تھی۔ جہاں بھی انسان کا درد دیکھا، وہاں رویا۔ جہاں بھی انسان کی عظمت دیکھی، اس کے آگے سر جھکایا۔ اپنے اولین دور کے افسانے "دو بیل" میں اس نے دیکھا۔ بیل گاڑی چلانے والا احمد خود ایک بیل تھا جس کی حالت اس کے بیمار سے بدتر تھی۔ وہ تڑپ اٹھا ــــ "کیا اس دنیا میں ایسا اسپتال نہیں

جہاں ان انسانوں کو داخل کیا جا سکے جن پر ظلم کیا جا رہا ہے؟"۔ "بمبئی میں اس نے ایک بھکاری کو سردی اور بھوک سے مرتے دیکھا اور وہ خدا سے منکر ہو گیا" "میں نے سوچا گھر جا کر رساکی ماں کو بتاؤں گا کہ اگر غریبوں کے پاس سوئیٹر نہیں تو کیا ہوا۔ ان کا خدا تو ہے جو انھیں سردی اور طوفان سے بچاتا ہے"

..... لیکن اچانک مجھے محسوس ہوا میرے سینے میں کسی نے خنجر گھونپ دیا ـــــ ابھی میونسپلٹی کی گاڑی آئی تھی اور گداگر کی لاش کو اٹھا کر لے گئی؟ اور میرے مُنہ سے نکلا "خدا نہیں ہے۔ اگر خدا ہے تو الٰہی یہ تیری برکت ہے؟ یہ کیسی برکت ہے؟"　　(ایک ادھ چھلا سنترہ اور ایک ڈبل روٹی کا ٹکڑا)

افسانہ "پھر کوئی نہیں آئے گا" انسانی دردمندی کا کلاسیکل افسانہ ہے۔ "رسم الفت" ایک مثالی انسان کی داستان ہے جسے وہ ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے ۔ "کیلاش تمھارا کلیجہ بھی پتھر کا تھا۔ کیا رسمِ اُلفت یوں نبھاتے ہیں کہ فرشتے بھی اس راہ پر نہ چل سکیں؟" "اگر میں مر جاؤں تو" خاموش انسانی محبت کی کہانی ہے۔ "جہاں میں رہتا ہوں" "دکھ اُٹھاتی انسانیت کا المیہ افسانہ ہے۔ "سہارا" ایک بہت اہم افسانہ ہے۔ اس میں ایک مرد اور عورت ایک حرامی اولاد کو قبول کرنے کے لئے نہ صرف مجبور ہیں بلکہ اسے سماج اور خدا۔ دونوں کا دیا، جینے کا واحد 'سہارا' ماننے پر مجبور ہیں۔

ڈنڈا مارنے کے لئے وہ بچے کی طرف بڑھا ـــ "حرامی"

تارا نے چیخ ماری۔ "اسے مت مار پگلے۔ یہ بیٹا نہ تیرا ہے نہ میرا۔ اسے تو اوپر والے نے بھیجا ہے ـــ میرے اور تمھارے بڑھاپے کا سہارا"　　(سہارا)

دی بلیو پرنٹ　The Blue Print　کو میں افسانہ نہیں مانتا۔ اسے میں انسانیت کا مینی فیسٹو۔ اور اس کا نوحہ مانتا ہوں اس میں ایک مرا ہوا انسان اور ایک جی رہا انسان ہے۔ جی رہے انسان کو مرے ہوئے انسان کے ہاتھوں میں سے ایک بلیو پرنٹ یعنی زندگی کا خاکہ ملتا ہے۔ خاکہ میں ایک خوبصورت زندگی کے ماحول اور پروگرام کا تفصیلی رنگ اور رس میں ڈوبا بیان ہے۔ اس خاکے میں جن آرزوؤں اور سپنوں کا ذکر ہے اگر وہ آدمی جیتا رہتا تو بھی پورے نہ ہوتے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں وہ نظام ابھی نہیں آیا جو انسان کے جمالیاتی شعور اور خوبصورتی کی پیاسی روح کی ان تمناؤں کو

پورا کر سکے ۔ جس دن ہمارا سماج ایک نیک اور ایماندار آدمی کو ایسی زندگی دے پائے گا، وہ ہمارے اور مہندر ناتھ کے سلام کا مستحق ہوگا لیکن جب تک وہ نہیں دے پاتا ۔ مہندر ناتھ کی یہ مانگ اس زندگی میں اور زندگی کے بعد عاقبت میں بھی انسانی سماج کے معماروں کا دامن کھینچتی رہے گی ۔

"میں یہ سب باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ شخص عین جوانی میں مرگیا ۔ یہ صرف ایک شخص کی موت کی داستان نہیں ہے ۔ اس موت میں میری موت بھی شامل ہے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی موت شامل ہے ۔ کیا کوئی ایسا نظام نہیں جس میں ہربنس لال کی خواب گاہ بن سکے ۔ جس کا ذکر اس بلیو پرنٹ میں کیا گیا ہے ؟" (دی بلیو پرنٹ)

اس طرح مہندر ناتھ اردو کا ایک اہم سیاسی افسانہ نگار اور ناول نگار ہے ۔ اس نے انسانی کردار اور انسانی معاشرے دونوں کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اور اس طرح اس تضاد اور اس انحطاط کا سبب بیان کیا ہے ۔ جس میں نہ صرف کل کا بلکہ آج کا ہندوستان گرفتار ہے ۔

" ہر شخص سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے ۔ وہ خود بھوکا ہوتا ہے تو دوسروں کو بھوکا سمجھتا ہے ۔ جب اس کی بھوک مٹ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا " (پتھر کے بت)

"شروع ہی سے مجھے انقلاب لانے کا چسکا لگا رہا ۔ انقلاب ہم نہ لاسکے ۔ اب بس ہم دوسروں کو اکساتے ہیں کہ تم انقلاب لاؤ...... ہم تماشائی کی حیثیت سے اسے دیکھیں گے ۔

(سورج ۔ ریت اور گناہ)

"غربت میں پیار کافی سستا ہو جاتا ہے ۔ جیب میں روپے نہ ہوں تو سوا ئے پیار بانٹنے کے آدمی کیا کر سکتا ہے ۔"

"تم نرے چغد ہو ۔ تم صرف بھائی بننے کے قابل ہو اور کچھ نہیں ۔ میاں انقلاب صرف دیواروں پر اشتہار لگانے سے نہیں آتا ۔ اور محبوبہ محض سعادت مندی سے ہاتھ نہیں آتی ۔ دونوں میں عمل کی ضرورت ہے اور تم میں عمل کا فقدان ہے ۔ (بھائی جان)

"یہاں سے وہاں تک پہنچنے کا فاصلہ تو زیادہ نہیں لیکن اس درمیانی فاصلے کو کیسے اور کیوں کر طے کیا جائے، شاید اسی پر انسانی زندگی کے عروج اور ارتقا کا دارومدار ہے۔

(یہاں سے وہاں تک)

"ان لوگوں کو ہوا کیا ہے؟ یہ خاموش کیوں ہیں؟ ہم تو انقلاب کے نقیب تھے۔ ہم میں سے بہت سے گولی کھا کر مر گئے۔ کچھ فاقوں کی تاب نہ لاکر چلتے بنے۔ کچھ زیادہ شراب پی کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ کچھ ایک فلیٹ اور کار سے کر مر گئے۔" (پتھر کے بُت)

بُنیادی درد

مہندر ناتھ کا سب سے بڑا درد یہی ہے۔ وہ آدمی کو یوں آدمیت سے گرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اپنے اگلے ناول "سورج ریت اور گناہ" میں اس کا ایک دردناک فقرہ ہے ــــ "میں ساری دُنیا کی بربادی دیکھ سکتا ہوں لیکن انسان کی بربادی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی" مہندر ناتھ کی ہر کہانی اور ہر ناول انسان کی بربادی کی کہانی ہے۔ اپنے ناول "سورج، ریت اور گناہ" ایک بار پھر سوانحاتی ہے اور اس درد کا بیان ہے جس میں سے مہندر ناتھ خود دانتے کی طرح گھٹنوں گھٹنوں نہیں، گلے گلے تک ڈوب کر گزرا ہے۔ اس کا ہیرو ہری پھر ایک بیکار نوجوان ہے جو شخصیت اور قابلیت کے باوجود بیکار ہے کیوں کہ عزت، خودداری اور اقدار کے معاملے میں سمجھوتہ نہیں کر پایا ہے۔ ایک ڈاکومینٹری بنانے کے سلسلے میں ایک چھوٹا سا کام ملتا ہے شوٹنگ کرنے بمبئی کے پاس ایک جگہ جاتا ہے۔ وہاں ایک پارسی لڑکی اس پر عاشق ہو جاتی ہے وہ اپنے ماں باپ سے بغاوت کر کے اس سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہے لیکن ہری کے پاس کام نہیں ہے۔ لڑکی اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے نرس بن جاتی ہے۔ ہری اس میں ایک جدو جہد کرنے والی شریکِ حیات کی جھلک دیکھتا ہے۔

ناول ڈاکومینٹری کی شوٹنگ سے شروع ہوتا ہے۔ ہری کو اس میں ایک انسٹرکٹر بنانا ہے

وہ اس کام کو پسند نہیں کرتا۔ مگر مجبوری ہے جب اسے نیکر پہنایا جاتا ہے اور اس کے ایک نقلی مونچھ لگائی جاتی ہے تو اس کا نوجوان وجود کراہ اٹھتا ہے۔

" لگا دو یار مونچھ۔ اگر تمھارے پاس پونچھ ہو تو وہ بھی لگا دو۔ اپنا خیال ہے دوست کہ اس کے لگانے کے بعد میرے سر پہ ایک بندر اور بٹھا دو۔ تب بھی شرم نہیں آئے گی مجھے۔"

ہری اچھے کام کی طرح سچی محبت کا بھی بھوکا ہے۔" ہائے اس کے دل کے اندر کتنے خوابناک سپنے تھے۔ اس کے اندر ایک اتھاہ ساگر تھا۔ کیا کسی نے اس کے اندر جھانک کر دیکھا؟ کیا کوئی لڑکی ایک غوطہ زن کی طرح اس کے دل کی گہرائیوں میں ڈبکی لگا کر دیکھے گی کہ اس ویرانے میں کتنی بہاریں پوشیدہ ہیں۔ اس اجاڑ بیابان میں کتنے شگوفے ہیں۔ کتنی سرسبز وادیاں ہیں؟ اس سبشتان ہیں کتنے سورج چمک رہے ہیں۔ کتنے دریا ہیں۔ کتنی لہریں ہیں۔ یہ دل بھی تو ایک سمندر ہیں۔ اوپر سے پُرسکون۔ چین سے لیٹا ہوا۔ لیکن اندر سے ایک اژدھے کی طرح مُنہ کھولے ہوئے۔ ایک ایک تمنا ہیبتناک چہرہ بنائے ہوئے۔

ہری کا تیسرا غم اس کا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ مہندر ناتھ کے ادب اور اس کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہ وہی کمرہ تھا۔ جس میں مہندر ناتھ جیا اور مرا۔ یہ کمرہ مہندر ناتھ کے ادب میں بار بار آتا ہے۔ اس کے لافانی افسانے " جہاں میں رہتا ہوں"۔ "آدمی اور سکّے" میں۔ "رات اندھیری" میں اور" اسکینڈل" میں۔ یہ کمرہ۔ کمرہ نہیں ہے بقول نارائن (رات اندھیری ہے کا مزدور نینا)۔" یہ بہت بڑا ناسور ہے جو بمبئی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہی نہیں پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ ...... اسے ٹھیک کرنا ہوگا۔ قابلِ نفرت یہ کمرہ نہیں ہے۔ وہ حالات ہیں جو اس کمرہ کو جنم دیتے ہیں۔"

یہ کمرہ سمبل ہے۔ آزادی کے بعد بھی عام انسان کے وہیں کے وہیں کھڑے رہنے کا۔

"سورج نکلتا تب بھی کمرہ میں روشنی نہ آتی ہر طرف اندھیرا۔ کمروں میں اندھیرا۔ برآمدے میں اندھیرا۔ نلوں پر اندھیرا۔ سیڑھیوں پر اندھیرا ـــ چہروں پر اندھیرا۔ کپڑوں پر اندھیرا۔ آنکھوں پر اندھیرا۔

دلوں پر اندھیرا۔ اندھیرے نے برسوں سے یہاں یلغار کر رکھی تھی۔ ایک مہیب قسم کی منحوسیت۔ ایک بے رحم بے حسی لاچاری۔ نفرت انگیز غربت۔ بھوک یاسیت چاروں طرف دم توڑ رہی تھی۔"

" جانے سے پہلے میرے گھر کی سیڑھیاں دیکھتے جائیے۔ یہ سیڑھیاں سنگِ مرمر کی نہیں ہیں۔ نہایت میلی گندی بدبودار سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں پر برسوں کی غربت کے نشان ہیں پہلی سیڑھی چڑھیں گے تو وہاں آپ کو ایک بچہ نظر آئے گا۔ نہایت دُبلا پتلا۔ ننگا۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا۔ ناک بہتی ہوئی۔ سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرتا ہوا۔ قریب ہی ایک بالٹی ہے جس میں تمام گھروں کا گندا رکھا ہوا ہے جب میں نیا نیا اس بلڈنگ میں آیا تھا تو بلڈنگ کی بدبو سے میرا دماغ متعفن ہو گیا تھا۔ لیکن اب یہ بدبو۔ یہ سیڑھیاں۔ یہ بچے۔ یہ مفلسی۔ یہ بیماری میری زندگی کا ایک جزو بن گئی ہیں۔ ان میلی سیڑھیوں کے سینے پر ہمیشہ گندے بچوں نے اپنے قدم رکھے۔ میلی سوکھی ہوئی گندی عورتوں نے اترتے چڑھتے ہوئے ان سیڑھیوں پر تھوکا۔ مردوں نے ان سیڑھیوں پر سے اپنی عورتوں کو دھکا دیا۔ تاکہ وہ مر جائیں۔ کبھی ان سیڑھیوں پر آسودہ دنوں نے جھانک کر نہ دیکھا۔ خوبصورت بچوں نے اپنے نرم بوٹوں سے انھیں پیار نہ کیا۔ نہ ہی نئی نویلی دلہنوں نے اپنی ساڑھیوں سے انھیں چھوا۔ رات کے اندھیرے میں ان سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کسی نے ایک دوسرے کا بوسہ نہ لیا۔ وہ بوسہ جس میں نشاط اور محبت کی گرمی ہو۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے کبھی کسی کے ہاتھ ایک دوسرے سے مس نہ ہوئے۔ یہاں صابن یا فنائل کے استعمال سے کچھ نہ ہوگا۔ محض سیڑھیاں دھونے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہاں تو کچھ اور ہی ......" (اسکینڈل)

مہندر ناتھ کو اس کمرہ پر بہت غصہ آتا تھا۔ مہندر ناتھ کو ان لوگوں پر بھی بہت غصہ آتا تھا جو اقدار کے پابند نہیں۔

" جب کوئی دوست اس سے جھوٹ بولتا تھا تو اس کا خون غصہ سے کھولنے لگتا۔ جب کوئی واقف کار کمینی حرکت کرتا تو کافی عرصہ تک وہ دل میں کڑھتا رہتا۔ اسی مسئلہ پر غور کرتا رہتا۔ پتھر اور دھات کے زمانے سے انسان نے اخلاقی اور روحانی طور پر کتنی ترقی کی ہے"

کیا انسان واقعی بدل گیا تھا۔ باہر کا انسان نہیں جو نائیلان کا سوٹ پہنتا تھا۔ نکٹائی لگاتا تھا۔ جو ریڈیو سنتا تھا یا سینما دیکھتا تھا۔ جو موٹر اور ہوائی جہاز میں سفر کرتا تھا بلکہ اندر کا انسان۔ کیا وہ واقعی بہتر انسان بن گیا تھا؟....... بنیادی طور پر انسان وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ اس کے رہن سہن بول چال۔ اس کی سائنسی ترقی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک طاقت کا بھوکا تھا۔ کینہ پروری اور رشتہ داروں کو آگے بڑھانا۔ اپنی انا کے سہارے باقیوں کو کچلنا اس کا روزمرہ کا کام تھا۔ ...... ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے بیٹھا تھا۔ ہر رہبر اپنے گرد چند حواریوں کو اکٹھا کر کے تقریر کر رہا تھا۔ اور لوگ بھوکے ننگے۔ جاہل۔ ان پڑھ ان کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے...... اسی لئے تو اسے کوئی چیز اچھی نہ لگتی تھی۔ نہ مرنے کو جی چاہتا تھا نہ جینے کو۔ زندہ رہنے کو...... زندہ رہنے کے لئے کوئی آدرش ہونا چاہیے۔ ایک ایسا نصب العین۔ جو انسان کو زندہ رہنے کے لئے مجبور کر دے۔ جو اس کی رگوں میں آگ بھر دے۔ دل کی ویرانیوں کو شاداب کر دے۔" (ناول۔ سورج۔ ریت اور گناہ)

سیاسی شعور

ہم انقلاب کے قابل نہیں۔ ہمارے ذہنوں میں تین کمرے کا فلیٹ۔ ایک کار۔ ایک بیوی۔ اس طرح گھسی ہوئی ہے کہ اس کا ذہن سے نکالنا مشکل ہے۔ چاندی کے سکّوں نے انقلاب کے حسین چہرہ پر ایک خوفناک لیپ کر دیا ہے اور اسے بدنما اور مکروہ بنا دیا ہے ہم سب اپنے اپنے بلوں میں گھس گئے ہیں۔ اپنی بیویوں اور بچّوں کے ساتھ کچھ سال زندہ رہیں گے۔ اور پھر اپنے اپنے بلوں میں مر جائیں گے۔ دراصل ہم سب چوہے ہیں۔" (سورج۔ ریت اور گناہ)

مہندر ناتھ کوتاہ نظر یا حقیقت سے انکار کرنے والا ادیب نہ تھا۔ وہ زندگی کے بُرے اور اچھے دونوں حقائق کو سمجھتا اور تسلیم کرتا تھا اسے ہندوستان کے آزاد ہونے کا احساس تھا۔

وہ فخر کرتا تھا کہ ہندوستان آزاد ہوگیا۔ اسے اس ترقی کا بھی احساس تھا جو ہندوستان کر رہا تھا۔ مگر اُسے ترقی کی سُست رفتاری .... محض اُوپر کے طبقوں کو نہال کرنے کا گلہ تھا۔ اس طرح مہندر ناتھ سو فیصدی وطن پرست، حقیقت آشنا تھا مگر اشتراکی تھا۔

"آزادی کے بعد کا ہندوستان ترقی کی طرف رواں دواں تھا۔ لیکن آزاد ہندوستان کے قدموں کی رفتار اتنی سُست تھی کہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کا قافلہ فاقوں میں مبتلا تھا۔ ایک نئی زندگی کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔ پُرانا نظام ختم ہو رہا تھا اور ایک نیا سُورج طلوع ہو رہا تھا۔ لیکن نئے سورج کی کرنیں اُونچے اونچے مکانوں اور برجوں پر پڑ رہی تھیں۔ جھونپڑوں اور کچی سڑکوں پر ابھی تک نگاہِ کرم نہ تھی۔ (سورج۔ ریت اور گناہ)

ادبی ایمان

مہندر ناتھ اشتراکی انقلاب کا قائل تھا۔ اس کے لئے یہ اندھیرے سے نجات اور روشنی تک رسائی تک مترادف تھا۔ یہ انسان کو اس کے بل سے نکال کر ایک بڑے مقصد والی جدو جہد میں فٹ کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک انسان کی بنیادی ضروریات کی گارنٹی سماج نہ دے گا۔ وہ اپنی خود غرضانہ جدوجہد میں لگا رہے گا اور کمین سے کمین تر ہوتا جائے گا۔ عجیب بات ہے کہ نقادوں نے مہندر ناتھ کو جنسی افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کیا۔ وہ مہندر ناتھ کے ناولوں اور افسانوں میں اس جنسی، اشتراکی رجحان کو نہ دیکھ پائے۔ جس کے سہارے مہندر ناتھ نے 'عورت' میں نہیں ایک نظام میں اپنے غم کا علاج دیکھا۔ اس کے افسانوں میں عورت کا بکنا یا پیشہ کمانا جنسی فعل نہیں ہے بلکہ وہ اقتصادی نظام کی کوتاہی ہے۔ جس میں عورت کام کر کے نہیں، جسم بیچ کر ہی جی سکتی ہے۔ جسم بیچنے والی عورت اور بیکار پھرنے والا نوجوان، دونوں نظام کا شکار ہیں اور بمبئی کے اونچے طبقہ میں تو مرد بھی عورت کی طرح بکتا ہے، جیسے عیش پسند دولت مند عورتیں خریدتی ہیں۔ جگدیش اور محبوب علی ایسے ہی کردار ہیں۔ اس طرح مہندر ناتھ بنیادی طور پر ایک

اشتراکی اور انقلابی ادیب تھا۔ جس نے اپنے افسانے یا ناول میں بے جھجک ایک انقلابی کردار کو پیش کرنے کی جرأت کی۔ وہ اس بات سے نہیں گھبراتا تھا کہ اسے پروپیگنڈسٹ کہا جائے گا۔ اس نے لکھا "اگر سچائی پروپیگنڈہ ہے تو اسے لکھنا ہر شریف آدمی کا کام ہے" اس لئے اس نے ببانگ دہل پروپیگنڈہ کیا۔ اس نے لکھا۔ "جو نظام انسانوں کو کام نہ دے سکا، ضرور ختم ہو جائے گا" (اجنبیوں کا شہر)۔ "یہ دُنیا مجھے بالکل پسند نہیں۔ میں اس دنیا میں بالکل رہنا نہیں چاہتا۔ ہاں اس قسم کی دنیا میں۔ یہ کہنے میں مجھے کچھ عار نہیں کہ مجھے امیر آدمیوں سے نفرت ہے۔ میں انھیں انسان نما حیوان سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ ایسی غلاظت سے آلودہ ہیں جسے کوئی صاف نہیں کرسکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس طرح کی دُنیا بدل دی جائے۔ میں کیمونسٹ نہیں۔ مگر مجھے کیمونزم کی غلاظتی پسند ہے" (سورج، ریت اور گناہ)

طرزِ تحریر

مہندرناتھ کا طرزِ تحریر سادہ ہے۔ کرشن چندر کی طرح اس میں شاعرانہ عناصر کی بہتات نہیں یقیناً اس نے کسی خاص طرزِ تحریر کو جنم نہیں دیا اور ہم مہندرناتھ کو "صاحب طرز" نہیں کہہ سکتے۔ اس کی تحریر میں گرامر کی غلطیاں ہیں اور نظم و ضبط کم نظر آتا ہے لیکن جہاں جذبات کی شدّت ہوتی ہے وہاں اس میں حیران کُن روانی اور شاعرانہ رنگ اُبھر آتا ہے۔

"بھول جاؤ۔ ان دیواروں کو بھول جاؤ۔ اس فرش کو بھول جاؤ۔ اس کے آگے کچھ نہیں۔ اس کے آگے پھسلنا ہے۔ گہری غار ہے۔ نگاہ کی کوئی مٹھاس نہیں۔ کوئی دلخراش آواز نہیں کوئی نغمہ نہیں۔ کوئی آہ نہیں۔ کوئی ٹیس نہیں۔ کوئی ساحل نہیں، کوئی لہر نہیں۔ کوئی جادو نہیں۔ کوئی آگ نہیں۔ کوئی درد نہیں۔ کوئی جنت نہیں۔ کوئی دوزخ نہیں۔ کوئی راحت نہیں۔ کوئی لگن نہیں۔ کوئی پیار نہیں۔ کوئی حسن نہیں۔ کوئی آواز نہیں۔ کوئی سنگم نہیں۔ اس ملن کے بعد جدائی ہے موت ہے۔ تاریکی ہے۔ بھوک ہے۔ بیکاری ہے۔ انسانوں کی کمینگی ہے۔ چھوٹے دلوں کی دُنیا ہے۔

چھوٹی دیواروں اور ٹیڑھی دیواروں کی دُنیا ہے۔"

ادبی حیثیت

بیشتر نقاد یہ کہتے آئے ہیں کہ مہندر ناتھ، کرشن چندر کے سائے کی وجہ سے اُبھر نہ سکا۔ ادب میں بھی چھوٹا بھائی بن کر رہ گیا۔ مہندر ناتھ تقسیم ملک کے وقت تک اُردو کے مقبول اور معروف ترین افسانہ نگاروں میں سے ایک تھا۔ اس وقت تک کا کوئی جریدہ اس کی کہانیوں سے خالی نہ ہوتا تھا۔ وہ ساقی، ادب لطیف، ادبی دُنیا جیسے چوٹی کے پرچوں کا مطلوبہ افسانہ نگار تھا۔ اس کے رنگ میں نہ کرشن چندر کے رنگ کی جھلک تھی اور نہ اس سے مغلوب رہنے کی مردنی۔ وہ اپنی جگہ آزادانہ طور پر کھڑا ایک ستون تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد بھی وہ پاکستانی رسالوں کا محبوب افسانہ نگار تھا آخردم تک اس کی اپنی 'ادبی ڈاک' کم نہ ہوئی تھی۔ اگر مہندر ناتھ شکار ہوا تو کرشن چندر کا نہیں، پورے ترقی پسند ادب کے نیتاؤں کا۔ ان نیتاؤں نے روس سرکار سے بھی دعوت نامے اور انعام لئے اور بھارت سرکار سے بھی۔ خود بھی لئے اور بیسیوں کو دلائے۔ سوویت لینڈ کے نہرو ایوارڈ وہ لے گئے جنہوں نے افسانے کے نام پر ڈھیلی چول کے ادبی ڈھانچے بھی نہ ٹھونکے تھے۔ لیکن مہندر ناتھ کی باری نہ آئی۔ کرشن چندر کا اثر کوئی اول مہندر ناتھ کی ادبی زندگی میں رہا ہے تو وہ یہ کہ وہ "غیر جانب دار" بنا رہا، مہندر کے لئے کہوں گا تو لوگ کہیں گے، بھائی کے لئے کہتا ہے؟۔ اسی ذہنی کمپلیکس میں کرشن چندر نے مہندر ناتھ کو اس کا دُنیاوی حق دلانے میں کوئی پارٹ ادا نہ کیا۔ اس ضمن میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مہندر ناتھ، کرشن چندر کا بھائی ہونے کی وجہ سے "اُبھر نہ سکا۔

لیکن حق یہ ہے کہ مہندر ناتھ کے ساتھ کے سارے ادیب اور شاعر مارے گئے کیوں کہ ہندوستان میں اردو ماری گئی۔ بٹوارے نے اردو کا بیڑا غرق کر دیا۔ اور پاکستان کی پالیسی نے ہندوستان اور پاکستان میں ادبی بیوپار ختم کر دیا۔ اگر مارکٹ کھلا رہتا۔ اردو کے پرچوں اور کتابوں پر "سرحدی پابندیاں" عائد نہ

ہوتیں تو مہندر ناتھ اُردو کا اتنا ہی درخشاں افسانہ نگار ہوتا۔ جتنا وہ جو بٹوارے سے پہلے "بن" گئے۔ علاوہ ازیں اردو کو نقاد نہیں ملے۔ اس ملک میں نقاد ہوئے ہی نہیں اور جو دو ایک ہوئے وہ دو چار ادیبوں کو پڑھ کر باقی کو پڑھنے سے دستبردار ہو گئے۔ اس صورتِ حال نے اُن ادیبوں کے ادب کی ادبی پیمائش نہ ہونے دی جو دوسرے دور میں آئے اگر مہندر ناتھ کا ذکر اردو تنقید میں کم ہے تو قصور مہندر ناتھ کا نہیں ہے۔ قصور ان نقادوں اور افسانہ نگاروں کا ہے جنہوں نے تقسیم ہند کے بعد پڑھنا اور لکھنا چھوڑ کر ادب سے زیادہ سیاست کے تالابوں میں سے مچھلی پکڑنا شروع کر دیا اور اپنی ادبی دوکانوں کے کواڑ گرا کر بورڈ ٹانگ دیا۔ "یہاں کا پہلا بزنس بند ہو گیا ہے کیونکہ اردو ادب میں جمود آ گیا ہے۔"

ادیب + انسان

اشتراکیت میں ایمان اور ادب میں اس کی ترویج نئی بات نہیں ہے۔ بہت سے ترقی پسند ادیبوں نے ایسا کیا۔ لیکن جو بات مہندر ناتھ کے قد کو ان سے اونچا بناتی ہے وہ عملی زندگی میں بھی اس کا اطلاق ہے۔ مہندر ناتھ آخری دم تک ترقی پسند تحریک کے ساتھ رہا۔ تنظیم میں بھی وہ پیش پیش رہا۔ وہ لمبے عرصے تک بمبئی شاخ کا سکریٹری رہا تھا۔ بھیمڑی میں جب ترقی پسندوں نے عملی جدوجہد کا ریزولیوشن پاس کیا تو مہندر ناتھ مکّا دکھانے والوں میں تھا۔ اس کے بعد اس نے فلمی مصنفوں کی انجمن کی تنظیم کی اور ان کے حقوق حفاظت کے لئے اس خلوص، لگن اور ایمانداری سے کام کیا کہ مرتے دم تک بلا مقابلہ جنرل سکریٹری چُنا جاتا رہا۔ جب اس کی موت ہوئی تو خواجہ احمد عباس نے کہا۔ "آج دُرگا دیوی ہی بیوہ نہیں ہوئی ہے فلم رائٹرس ایسوی ایشن بھی بیوہ ہوئی ہے۔" مہندر ناتھ بیکار رہا۔ وہ اس کمرہ سے بڑا کمرہ نہ لے سکا۔ جس میں وہ ۲۵ سال پہلے آیا تھا۔ اس نے کوئی بینک بیلنس نہ چھوڑا۔ وہ بہت سی چیزیں حاصل کر سکتا تھا لیکن اس نے حاصل نہ کیں۔ کیوں کر ان کے لئے

اسے اقدار سے گرنا پڑتا تھا۔ اس کا ادبی ایمان کتابوں تک محدود نہ رہا۔ وہ اس کی زندگی میں بھی سرایت کر گیا۔ اور مہندر ناتھ اس تضاد کا شکار نہ ہوا۔ جس کے شکار آج بہت سے ترقی پسند ہیں۔ "چاندی کے تار" والا مہندر ناتھ۔ آخر تک قد میں باون گز اور کھرے پن میں ۲۶ کیرٹ کا رہا۔ مہندر ناتھ ادیب نفی انسان نہیں، ادیب جمع انسان تھا۔

ایک عاشق

لیکن مہندر ناتھ محض اشتراکی، یا آدرش وادی نہ تھا۔ وہ ایک بڑا عاشق تھا۔ یونانیوں کی طرح وہ تندرست جسم اور صحت مند محبت کا قائل تھا۔ اسے دھوپ سے اور چاندنی سے محبت تھی۔ جسم کو وہ زندگی کا جمالیاتی مظہر سمجھتا تھا۔ اسے مریل جسم اور نیم مُردہ جذبے سے نفرت تھی بلکہ اس کی لڑائی اس نظام اور اس ذہنیت سے تھی جو ان کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے ناولوں اور کہانیوں میں جا بجا کولھوں، چھاتیوں، پنڈلیوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کا ذکر وہ بے جھجک کرتا ہے مگر یہ سیکس نہیں صحت کے نشان ہیں۔ مہندر ناتھ خود ایک چھ فٹ کا تندرست نوجوان تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ہر انسان اس کی طرح صحت سے مالا مال ہو۔ اسے عورت سے بے پناہ عشق تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چاندی سی عورت سکّوں کے لئے بکے۔ وہ عورت سے محض جنسی رشتے کا قائل نہ تھا وہ اسے اپنی زندگی میں برابر کا باقاعدہ رتبہ دینا چاہتا ہے اور اس کی کہانیوں کا المیہ یہ ہے کہ جو عورت ملی، وہ بکی ہوئی تھی۔ بک رہی تھی یا آدمی اسے باعزت اور اقتصادی اعتبار سے محفوظ زندگی دینے کے اہل نہ تھا۔ ادب میں عورت کو معشوق نہیں، باعزت بیوی کا روپ دینے کی سماجی خواہش مہندر ناتھ کے ادب کا خاصہ ہے۔ عورت کے لئے اس کا عشق بستر میں چند لمحوں سے پھیل کر زندگی کے اس چھور سے اس چھور تک "پورے ساتھ" کے آدرش میں ڈھل گیا تھا۔

فطرت

مہندر ناتھ کرشن چندر کا بھائی اور کشمیر کا باسی تھا۔ کرشن چندر کی طرح اس کے ادب

یں فطرت ایک کردار یا ایک پس منظر کے طور پر نہیں آتی ہے ۔ اس کے ادب میں ناریل کے پیڑ، سمندر ۔ نیلے آسمان، چمکیلی دھوپ، نم ہوا اور اوس کا ذکر ہے لیکن یہ سب اپنی الگ ہستی نہیں رکھتے ۔ یہ ایک کھلی ۔ بے گھٹن اور صحت مند زندگی کی اُمنگ کے نشان ہیں ۔ مہندر ناتھ فطرت کے پاس واپس جانا نہیں چاہتا ۔ لیکن وہ ایک ایسا کھلا مکان چاہتا ہے جس میں سے وہ ان کو دیکھ کر اپنے جسم اور اپنے جذبے کو زندگی اور تابناکی بخشتا رہے ۔ اس طرح فطرت کی ضرورت مہندر ناتھ کو شاعر کی طرح نہیں "ٹاؤن پلانر اور فن تعمیر کے ماہر" آرچی ٹیکٹ کی طرح ہے ۔

مہندر ناتھ کے ادب میں جمود نہیں ۔ کیوں کہ اس نے بلیو پرنٹ" ۔ "اگر میں مرجاؤں تو" "چائے کی پیالی" "ایک پھول ایک کار" ۔ "ادھ چھلا سنگترہ اور ڈبل روٹی کا ٹکڑا" "اجنبیوں کا شہر" "لوفر" "رات اندھیری ہے" اور "سورج ریت اور گناہ" جیسے افسانے اور ناول لکھے ۔

مہندر ناتھ انسانوں میں ادیب نہیں تھا ۔ ادیبوں میں انسان تھا ۔ یہ بات اس کی ذات تک محدود نہیں ہے اس کے ڈانڈے اس کے ادب سے بھی ملتے ہیں ۔ اس کی لوح پر یہ عبارت بے جھجک لکھی جا سکتی ہے ۔

سرلا دیوی

پھر تیرے کوچے کو جاتا ہے خیال

"میرے بچپن۔ جوانی اور چالیس کو پار کرتی عمر کی یادوں کی چادر، جو میرے بھائی مہندر ناتھ کی باتوں اور زندگی کے سنہری تاروں سے بنی ہے۔ میرے گرد اس طرح چمٹی ہوئی ہے۔ جیسے میرے جسم کی جلد۔

سچ پوچھئے تو مہندر جی کی موت کے بعد، یادوں کی اس چادر کو، جسے میں نے ہمیشہ کے لئے اوڑھ لیا ہے۔ میں اُدھیڑنا نہیں چاہتی۔ لیکن یہ بھی ایک کڑوی حقیقت ہے کہ مجھے اس کو اُدھیڑنا ہوگا۔ اور اس تکلیف کو سہنا ہوگا۔ ہاں اس تکلیف کو، جو جسم کی چمڑی اُدھیڑنے والے کو سہنی ہوتی ہے۔ کیوں کہ مہندر جی پر ایک نمبر نکل رہا ہے۔ اور مجھے ان پر لکھنا ہے۔ ضرور لکھنا ہے۔ ان کی موت کے بعد۔

یہ نمبر نکل رہا ہے، اور نکلے گا۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ نمبر ان کی زندگی میں نہیں نکلا۔ کاش وہ بھی مسرت کے وہ چند لمحے جی لیتے جو ایک ادیب کی زندگی میں آنے چاہئیں کیوں کہ وہ ادب کے لئے اپنی زندگی کی بازی لگاتا ہے۔

مہندر جی کو ایک دو سال سے یہ چاہ کچوکے لینے لگی تھی کہ ان پر نمبر نکلے۔ انھوں نے تیس کے قریب کتابیں لکھیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ادب کی خاطر انھوں نے نوکری نہیں کی تھی۔ بہت غم سہے خونِ جگر پیا مگر نتیجہ۔ وہی ڈھاک کے تین پات۔ سچ مانئے اس نمبر

کے لئے ان کے دل میں ایک تڑپ تھی۔ ارمان تھا۔ چاہ تھی پر ان کی زندگی میں کچھ نہ ہوا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ جب موت کے بعد کسی ادیب کا نمبر نکلتا ہے۔ یا پدم شری ملتا ہے۔ یا مرنے والے کے کارناموں کا چرچا ہوتا ہے "سرلا" عجیب وغریب دُنیا ہے۔ اب نمبر نکل رہے ہیں، سنگ مر مر کی سمادھی بن رہی ہے۔ قبر پر سجدے ہو رہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں۔ جو دینا ہے بھئی زندگی میں دے دو " بھئی اگر سنگِ مرمر کا کرشن نہیں دے سکتے تو سیمنٹ کا دے دو۔ مگر زندگی میں دے دو۔

لیکن مہندر جی کی باتیں کس نے سُنی کس نے سمجھی۔ شاید اسی لئے وہ بچپن میں پتھروں سے کھیلا کرتے تھے ــــ

ان سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ دیواروں کو کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ہماری ماں جی کہتی۔ ناتھ نے (مہندر جی کو وہ ناتھ پکارا کرتی تھیں) کبھی کھلونوں کے لئے ضد نہیں کی کبھی چابی والی موٹر نہیں مانگی۔ بس کچھ پتھر لئے ایک ہاتھ میں کسی پیڑ کی ٹہنی لی اور گھر کے کسی کونے میں پتھروں کو لے کر بیٹھ گئے کسی پتھر کو راجا کسی پتھر کو رانی اور کسی کو غلام بنا لیا۔ اور ان سے کبھی دھیرے دھیرے بات کرتے کبھی زور سے اور کبھی پتھروں کو ٹہنی سے پیٹتے۔"

جب ماں جی دوڑی جاتیں اور پوچھتیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ تو مہندر جی کہتے یہ راجا اور رانی غلام کو مار رہے ہیں میں انھیں مارنے نہیں دوں گا۔

"ماں جی کہتی۔ بیٹا یہ تو پتھر ہیں۔"

"نہیں۔ مہندر جی کہتے۔ یہ راجا رانی ہیں۔ آج انھیں ٹھیک کر کے رہونگا۔"

"ہش۔ ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ ہم تو راجہ کے راج میں۔ رہ رہے ہیں۔ ایسے نہیں کہتے۔"

"نہیں۔ آج انھیں ٹھیک کر کے رہونگا۔

"اچھا جو میں آئے ۔ تیرے کھیل ہی نرالے ہیں۔ ماں جی ہنستی چلی جاتیں۔

"آخری دم تک مہندر جی کے کھیل نرالے ہی رہے۔

جب سے ہوش سنبھالا مہندر جی اور کرشن جی کو ساتھ ساتھ دیکھا۔ کبھی اکیلا نہیں دیکھا۔ کھانا کھا رہے ہیں تو ایک تھالی میں سو رہے ہیں تو ایک بستر میں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بے حد پیار تھا۔ ہم نے ان کا کبھی الگ الگ تصور نہیں کیا۔ ماں جی ہمیشہ نوکروں سے کہا کرتیں۔ کاکوں کا کھانا لگا دے۔ کاکوں کا بستر لگا دے۔ کاکے پڑھ رہے ہیں۔ کاکوں کے دوست آئے ہیں۔

لیکن پھر بھی دونوں بھائیوں کی فطرت میں بڑا فرق تھا۔ کرشن جی گھر کے معاملوں میں دخل نہ دیتے تھے۔ زیادہ بات نہیں کرتے لیکن مہندر جی۔ گھر کی ساری باتیں ان سے ہوتی تھیں۔ اور گھر کا سارا کام ان کی رائے سے ہوتا تھا بابو (پتا جی) کرشن جی دونوں ان کی رائے پر چلتے۔ ان کی رضا کے بنا، گھر میں پتہ تک نہ ہلتا۔

میں بہت چھوٹی تھی۔ ماں جی کو نہ جانے مکان بنانے کی کیا سوجھی۔ وہ بھی وزیر آباد میں جہاں ہمارے دادا رہتے تھے۔ ہم لوگ وہاں کبھی نہ رہے۔ ہمارے بابو جی کو مکان دوکان بنانے کا قطعی شوق نہ تھا۔ گھر میں اکثر اسی بات کو لے کر بحث ہوتی۔ بابو جی کہتے۔

"بھلے، لوکے! میں کہتا ہوں۔ فرضی مکان بنانے کے چکر میں نہ پڑ ایسے مکان بنا رہا ہوں جو زندگی بھر تیرا ساتھ دیں گے۔ ایسا نام پیدا کریں گے کہ دنیا دیکھے گی۔"

(ان کا اشارہ کرشن جی اور مہندر جی کی طرف ہوتا)

"لیکن ماں جی اپنی ہٹ کی پکی تھیں۔ اس لئے انھوں نے مہندر جی کو تھام لیا۔

"بیٹا دیکھ اپنے سب رشتہ داروں کے مکان ہیں۔ اپنے بزرگوں کے شہر میں مجھے ایک مکان ضرور بنوانا ہے۔ جس سے رشتہ دار یہ نہ کہیں کہ پیسہ رکھنا نہ آیا۔ کھایا اور اڑایا۔ تو اپنے بابو جی کو سمجھا۔ کہ مجھے مکان بنوانے سے نہ روکیں۔"

مہندر جی بابو جی کے پاس گئے۔ "آپ ڈاکٹر ہیں۔ ہر مرض کی دوا کرتے ہیں۔ سوچئے ماں جی کو یہی ایک مرض ہے جسے آپ کو ٹھیک کرنا ہے۔"

سب زور سے ہنسے، اور دوسرے دن ماں جی مکان بنوانے وزیر آباد چلی گئیں۔

لیکن۔ ہم بھائی بہنوں میں سے کسی نے وہ مکان نہ دیکھا۔ ہمارے بابو جی کبھی نہ گئے۔

ماں جی مہندر جی سے اصرار کرتیں کہ تو ہی مکان دیکھ آ۔ کتنا خوبصورت بنوایا ہے۔"

لیکن مہندر جی اتنا کہہ کر بات ختم کر دیتے۔" میں تو اپنے بھائی کو دیکھتا ہوں۔ وہی میرا سب سے بڑا محل ہے۔

دسویں تک مہندر جی پونچھ میں پڑھے۔ پھر کرشن جی کے ساتھ لاہور چلے آئے۔ گھر جیسے ویران ہو گیا۔ بابو جی کے پاس میں اور میرا چھوٹا بھائی اوم رہ گئے۔ ماں جی اکثر پنجاب رہا کرتی تھیں جہاں ان کے بھائی بہن تھے۔ آج کسی کی شادی میں کل کسی کی غمی میں، اوم اسکول پڑھنے چلا جاتا۔ پونچھ میں لڑکیوں کا اسکول پانچویں تک تھا۔ میں پانچویں کے بعد کیا کروں۔ میں نے مہندر جی کو لکھا " میرا بھی کچھ سوچئے۔ مجھے بھی لاہور بلالو۔ میں بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔

" بھائی صاحب نے جواب دیا۔ سرلا تم بہت چھوٹی ہو۔ تمھیں یہاں کہاں بلاؤں لیکن گارنٹی کی بات ہے کہ تمھارے بڑے ہونے تک بہت بھاری انقلاب آئے گا۔ لڑکی کو پڑھنے کے لئے۔ اپنے بھائی یا ماں کی منت کرنی پڑے گی۔ تب اندھیرا پاش پاش ہو جائیگا۔ اور روشنی خود تم لوگوں کے قدم چومے گی۔ لیکن انقلاب کے لئے لگاتار جدوجہد کی ضرورت ہے۔

"میں نے پہلی بار انقلاب کا لفظ مہندر جی سے سُنا۔ مہندر جی نے اس خط میں لکھا تم اوم سے خالی وقت میں اردو پڑھنا سیکھو۔ خالی بیٹھنے سے انقلاب نہیں آتا۔" اور انھوں نے مجھے خالی بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ لاہور سے میرے لئے اردو میں پریوں کی کتابیں بھیجتے اور لکھتے کہ انھیں پڑھ کر رکھنا جب ہم چھٹیوں میں گھر آئیں گے تو تم سے لفظ بہ لفظ سُنیں گے۔

تو اردو میں نے اس طرح مہندر جی کے اکسانے سے سیکھی۔

بھائی لوگ گھر آئے تو میں مہندر جی سے رات کو کہانیاں سُنانے کو کہتی۔ مہندر جی کہتے میں بھوت پریت کی کہانیاں سُناؤں گا۔ تم پریوں کی سُنانا۔

نہیں بھاپا جی۔ بھوت پریتوں کی نہیں۔ ہمیں ڈر لگے گا۔

"جو ڈرا سو مرا" وہ کہتے " ویسے بھوت پریت نام کی کوئی چیز نہیں۔ لیکن زندگی بڑی سنگین ہے۔ سب کچھ سُننے کے لئے دل کو تیار رکھنا چاہیئے۔

شاید انھیں دنوں کی بات ہے۔ ایک دن مہندر جی کا لاہور سے پوچھ میں تار آیا" کرشن جی کہیں لاہور سے باہر چلے گئے ہیں۔ میں ان کے یوں چُپ چاپ چلے جانے سے اکیلا رہ گیا ہوں۔ نہ معلوم میرا بھائی مجھ سے روٹھ کر کہاں چلا گیا۔

یہ تار پڑھ کر ہم سب پتھر سے ہو گئے۔ زندگی بہت سنگین ہے۔ اس کا مطلب سمجھ میں آنے لگا۔ ماں جی پاگل سی ہو گئیں۔ مہندر جی دلاسا دیتے۔" میرا بھائی جینیس ہے۔ ماحول راس نہیں آیا۔ لیکن میری ہمت اور آپ کی ممتا " اسے ضرور ہمارے پاس واپس لائے گی۔

جب تک کرشن جی واپس نہیں آئے، مہندر جی کالج نہیں گئے۔

لیکن میرا یہ ڈھارس دینے والا بھائی آج کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ آنکھ آنسو سے بھری ہے۔ کرشن جی ٹوٹے ہوئے پھرتے ہیں۔ دھیرج دینے والا وہ بھائی کہاں گیا۔ وہ ہماری طرف مُڑ کر نہیں دیکھتا۔ میں مُڑ کر پیچھے دیکھتی ہوں"

بھائی صاحب کے واپس آجانے پر ماں جی بھی ان کے ساتھ لاہور چلی گئیں، اور میں بھی، زندگی میں گہمی گہمی آگئی۔ قہقہے گونجتے رہتے۔ ایف اے تک مہندر جی کا قد چھوٹا تھا۔ کسی نے گینڈا کہہ دیا۔ بس بات دل کو لگ گئی۔ دوسرے ہی دن ورزش کے لئے

مگدر وغیرہ خرید لائے ۔ ڈنڈ پیلے اور طرح طرح کی ورزشیں کیں ایک سال میں قد کو سرو کے پیڑ کی طرح لمبا کرلیا ۔ ہمارے گھر میں وہی سب سے خوبصورت تھے ۔

مہندر جی کو انھیں دنوں پتنگ اُڑانے کا شوق چرایا لیکن کرشن جی اس کے بالکل خلاف تھے وہ مہندر جی کو سمجھاتے کہ کیا آٹھوں پہر پتنگ بازی کے چکّر میں پڑے رہتے ہو۔ لیکن مہندر جی نہ مانتے ایک دن دونوں بھائیوں میں مار پیٹ ہوگئی ۔ ایک دوسرے پر میز کرسیاں پھینکیں ۔ آخر مہندر جی نے ان سے پوچھا۔ آپ پتنگ اُڑانے سے روکتے کیوں ہیں ؟ ۔

"بھئی اگر ڈور سے تمھارا انگوٹھا کٹ گیا ۔ دراصل میں تمھاری انگلی میں خون بہتا نہیں دیکھ سکتا ۔

یہ بات ہے ؟ تب آج سے پتنگ بازی بند" مہندر جی کرشن جی کے گلے سے لپٹ گئے ۔ یہ بھی ان کی محبت ۔

ایک دفعہ کرشن جی کو یرقان ہوگیا ۔ ہم لوگ پوچھ کی تحصیل مہنڈر میں تھے کرشن جی کالج سے چھٹی لے کر گھر آگئے ۔ دو دن بعد مہندر جی بھی اپنا سامان لے کر گھر آگئے ۔ ماں جی اور بابو جی نے کہا نالائق تمھارے امتحان کے دن نزدیک آرہے ہیں اور تم یہاں چلے آئے ۔ ؟

"ماں جی میرا بھائی بستر پر بیمار پڑا ہے اور میں اس سے دور رہوں ۔ یہ نہیں ہوسکتا !

کرشن جی کی بیماری لمبی ہوگئی ۔ یرقان ٹھیک ہونے میں نہ آیا ۔ ماہ گذر گئے ماں جی اور بابو جی فکرمند رہتے ۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ مہندر جی مکان کے باہر کی دیوار کے ساتھ لگے رو رہے تھے ۔ اور رو رو کر کہہ رہے تھے ۔ بھگوان میرے بھائی کو ٹھیک کردے ۔ میں سچ کہتا ہوں میں اس کے بنا نہیں رہ سکتا ۔

معلوم نہیں دُعا کا اثر یا دوا کا ۔ کرشن جی ٹھیک ہوتے گئے ۔

پھر دونوں بھائی لاہور چلے گئے ۔ اس سال کرشن جی پاس ہوگئے اور مہندر جی

فیل ، ماں جی نے فیصلہ کیا کہ ناتھ فیل ہوگیا اس لئے کرشن جی کے پاس ہونے کے لڈو شہر میں نہ بانٹوں گی۔

لیکن مہندر جی نے جھٹ سے نئے کپڑے پہنے اور ماں جی سے کہا۔" ماں جی لڈو بانٹیئے۔ کیا ہوا میں فیل ہوگیا۔ میرا بڑا بھائی تو پاس ہوگیا۔ جو گھر میں بڑا ہے وہ تو پھل پھول رہا ہے۔ ہم سب تو اس کی چھایا ہیں ،

گھر میں ایک دم خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ماں جی نے شہر میں لڈو بانٹ دیئے۔

کرشن جی نے ایم اے کیا ، پھر ایل۔ ایل۔ بی پاس کرلیا۔ اور مہندر جی ایم۔ اے تک پڑھے۔ کرشن جی پونچھ میں نوکری کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بابو جی تو چاہتے تھے مہندر جی پونچھ میں رہیں۔ انھیں کے نام پر انھوں نے " مہندرا میڈیکل ہال کھولا۔ لیکن مہندر جی نے صاف کہہ دیا۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ کلینک میں نہیں بیٹھوں گا۔ " نیم حکیم خطرۂ جان کی کہاوت نہیں دہراؤں گا " انھوں نے کہاوت نہیں دہرائی۔

دونوں بھائی جوان ہوگئے تھے۔ ماں جی کو ان کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔ مہندر جی کے لئے پونچھ کے امیر خاندان کی خوبصورت لڑکی کا رشتہ آیا۔ لیکن مہندر جی نے صاف منع کر دیا۔ پہلے بڑے بھائی کی شادی ہو جائے۔ پھر میرا سوال اُٹھے گا۔

ماں جی بہت دن تک سمجھاتی رہیں۔" ناتھ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ گھر بہت اچھا ہے۔ ابھی شادی کی نہیں۔ سگائی کی بات ہے۔ تم سگائی کرلو۔ آخر ایک دن مہندر جی نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔" ماں جی اصل بات یہ ہے کہ میں شادی وادی کے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

اس لڑکی کو میں اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ میری پیاری سہیلی تھی۔ ماں جی نے لڑکی والوں کو نہ جانے کیوں دو ٹوک جواب نہ دیا وہ دو سال تک آس لگائے رہے۔ لڑکی بھی مہندر جی کو بہت چاہنے لگی۔ اور جب بھی میرے ساتھ ہوتی۔ مہندر جی کی بات کرتی رہتی۔ مہندر جی کی کہانی " چاندی کے

تار“ اور ناول ” رات اندھیری “ کا ایک حصّہ اسی کے بارے میں ہے ۔

کرشن جی کی شادی کے بعد ہم سب دلّی میں آ گئے ۔ مہندر جی نے کہانی ۔ ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کئے ۔ وہ مشہور ہونے لگے ۔ یہ بات شاید ۱۹۴۰ء کے قریب کی ہے ۔ ماں جی کہتی ۔ ناتھ تم لکھنا وکھنا چھوڑ کر نوکری کر لو ۔ مہندر جی نے انکار کیا ۔ ماں جی بہت پیچھے پڑیں تو امتحان دے دیا ۔ پاس بھی ہو گئے لیکن نوکری نہیں کی ۔

”کرشن جی کا تبادلہ لکھنؤ ہوا ۔ مہندر جی بستر باندھ کر تیار ہو گئے ۔ ماں جی نے کہا ۔ ”تم لکھنؤ مت جاؤ ۔ کیا تم بھائی کے پچھ لگو ہو ۔ انھوں نے جواب دیا ۔ ہاں مجھے اپنے بھائی کا پچھ لگو ہونے پر ناز ہے ۔“

پھر بڑے بھائی صاحب پونہ چلے گئے ۔ مہندر جی بھی پونہ چلے گئے ۔ پھر کرشن جی بمبئی آ گئے ۔ مہندر جی بھی ان کے ساتھ ہی بمبئی آ گئے ۔ دونوں بھائیوں نے فلم کا دھندا شروع کیا ۔ بھائی صاحب نے فلم بنائی ۔ ” سرائے کے باہر “ اور ” راکھ ۔ مہندر جی ہیرو بنے ۔“

ایک دن ماں جی نے سوٹنگ دیکھنے پر اصرار کیا ۔ دیکھوں تم وہاں کیا کرتے ہو ۔ ماں جی شوٹنگ سے واپس آئیں تو رونے لگیں ۔“ ناتھ تم مُنھ پر رنگ پوت کر سوانگ کرو گے ۔ تم تو افسر بنتے ۔ یہ تو بہروپیا کا کام ہے ۔

مہندر جی نے جھٹ جواب دیا ۔ ماں جی ۔ کیا آپ روز گیتا میں یہ نہیں پڑھتیں کہ یہ دُنیا ایک سوانگ ہے ۔ ایک تماشہ ہے اور ہم سب بہروپیا ہیں ؟ پھر اس کام میں کیا دوش ہوا ؟ دوش نہیں ہوا ۔ !

ماں جی خاموش ہو گئیں مگر پھر فوراً بول اٹھیں ۔ اچھا تو شادی کر لے ۔ سات پھیرے لے لے کسی لڑکی سے ۔ وہ تمھیں باندھ لے گی ۔

” ماں پھیرے لینے سے کیا ہوتا ہے ۔ کیا انسان کسی لڑکی سے بندھ جاتا ہے“

مہندر جی بولے ۔ سات پھیرے لے کر اگر میں لڑکی کو چھوڑ دوں تو اس کی کوئی گارنٹی ہے۔؟ بندھن تو من کا ہوتا ہے ۔ جس دن میں کسی لڑکی کے ساتھ بندھ جاؤں گا ۔ سات پھیروں کی بھی ضرورت نہ رہے گی ۔

اور یہی ہوا ۔ انھیں دنوں میں نے درگا بھابھی کو دیکھا ۔ کرشن جی کے لڑکے رنجن کا جنم دن تھا درگا بھابی نے لال ساری پہن رکھی تھی ۔ دونوں کلائیوں میں دھانی رنگ کی چوڑیاں جھنجھنا رہی تھیں ۔ بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں ۔ میوزک ڈائرکٹر دتا صاحب کی بیوی نے بتایا ۔ یہی مہندر جی کو باندھ کر رکھے گی سرلا ۔

قسمت کی ضد یا اس کا پھیر ۔ دونوں بھائیوں نے جو فلم بنائی فیل ہوئی "سرائے کے باہر" دتی میں ریلیز ہوئی تو اگلے دن سے فساد شروع ہو گئے ۔ دوسری فلم ڈبے سے باہر ہی نہ نکلی ۔ اس ناکامیابی کا اثر مہندر جی کی زندگی پر زیادہ پڑا ۔ تنگی کے دن شروع ہو گئے ۔ لیکن انھوں نے گلہ یا شکوہ نہ کیا ۔ آشا دادی ہو کر خط لکھتے رہے ۔ سرلا فلمی دُنیا ہے ہی ایسی ۔ کبھی نرم کبھی گرم ۔

"ماں جی بمبئی لکھتیں ۔ " ناتھ ایک لڑکی کا باپ ہے کہتا ہے ۔ بہت اچھی نوکری دلواؤں گا ۔ بس میری لڑکی کا رشتہ لے لو ۔ مہندر جی فوراً جواب دیتے " ماں جی آپ کا بیٹا چند سکوں کے لئے نہیں بکے گا ۔ فی الحال میری شادی کی بات چھوڑ کر سرلا کی شادی کی فکر کیجئے ۔"

میں گھر میں کھُل کر بس مہندر جی سے بات کرتی تھی ۔ وہ بھی اپنی باتیں مجھ سے کہتے تھے ۔ اپنے عشق کی داستانیں تک سُناتے تھے ۔ اپنے عشق کا اقبال میں نے سب سے پہلے مہندر جی ہی سے کیا ۔

بمبئی میں میرے لئے وہ شام بڑی اداس اور خاموش تھی ۔ میرے سامنے ناریل

اور چیکو کے پیڑ مستی میں سمندر کی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ میں کوور لاج کے وسیع برآمدے میں اکیلی کھڑی تھی۔ بے حد فکر مند تھی کیوں کہ دوسرے دن میری کہیں سگائی ہونے والی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا مہندر جی آ کھڑے ہوئے ہیں۔

"سرلا یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو؟

"یونہی"

"نہیں، ضرور کوئی بات ہے۔ بتاؤ۔

میں نے دل کڑا کر کے مہندر جی سے کہہ دیا " بھائی صاحب جی میں یہاں قطعی شادی نہیں کروں گی"

"کیوں نہیں کرو گی۔ کوئی وجہ تو ہوگی۔

"میں خاموش ہوگئی۔

"یہاں تک ہمت کی ہے تو آگے بھی بڑھو۔ صاف صاف بتا دو۔ لیکن جھوٹ نہیں بولنا۔

میں نے ڈر کر کہا۔ میرا ارادہ ریوتی جی سے شادی کرنے کا ہے۔

"ٹھیک ہے" مہندر جی نے کہا۔

لیکن ماں جی نہیں مانیں گیں۔ کیوں کہ وہ برہمن ہیں۔

" ریوتی جی کے ماں باپ بھی کہاں مانیں گے۔ لیکن ٹھیک ہو جائے گا۔ تم جا کر آرام کرو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔

میری ماں جی۔ بابو جی اور کرشن جی کو انھوں نے منا لیا۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ یہ بات نہ تھی، کہ انھیں صرف مجھ سے محبت تھی۔ وہ ہر آدمی کے جذبے کی عزت کرتے تھے۔

مہندر جی کے کچھ آدرش تھے۔ جن کے اوپر وہ ساری عمر قائم رہے۔ وہ ایسے

آدمی نہ تھے جو کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ ان کا دل بہت بڑا تھا۔ دوسرے کا درد اپنا درد سمجھتے تھے۔ دوسروں کی غریبی کا کبھی مذاق نہ اڑاتے تھے۔ جو بن پڑتا تھا کرتے تھے لیکن اس کا ڈھنڈورا نہ پیٹتے تھے۔ ایک بار میں لگاتار دو ماہ ان کے پاس رہی۔ میں نے دیکھا چائے کے وقت بھی دو چار آدمی ہوتے ہیں۔ کھانے کے وقت بھی اور سب کو اسی محبت سے کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اگر چپاتی ختم ہو گئی تو ڈبل روٹی منگالی جاتی ہے۔

کئی بار ہم لوگ کہتے۔ "عجیب لوگ ہیں عین کھانے کے وقت آدھمکتے ہیں۔ اُدھار کھایا ہے کیا آپ نے اس کا! جواب دیتے بھائی یہ فلمی دُنیا ہے بس ایک دلدل ہے۔ دلدل۔ جو پھنستا ہے۔ پھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ ویسے یہ لوگ کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔ جو کام نہیں بنتا۔ دن بھر کام کی تلاش میں گھومنا پڑتا ہے۔ کھانے دو کیا فرق پڑتا ہے مجھے کیا بلڈنگ کھڑی کرنی ہے۔!

انھیں دنوں کی بات ہے۔ میں صبح اُٹھی تو دیکھا کمرے کے باہر ایک آدمی تولیا باندھے کھڑا ہے۔ اور مہندر جی اسے روپۓ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کون تھا بھائی صاحب، "تھا کوئی مصیبت کا مارا۔ اور مہندر جی خاموش سے اخبار دیکھنے لگے تھوڑی دیر بعد وہ آدمی پینٹ قمیص پہن کر کمرے میں داخل۔ درگا بھابی چائے لے آئیں۔ سب نے ساتھ چائے پی۔ جب وہ آدمی چلا گیا تو میں نے کہا — " یہ کیا۔ ابھی تو یہ آدمی تولیہ باندھے کھڑا تھا۔ مہندر جی نے بتایا۔ ایک افسانہ نگار ہے۔ اس فلمی دُنیا نے کیا گت بنادی ہے۔ بیچارے کے پاس ایک پینٹ اور قمیص رہ گئی ہے لانڈری پر دھونے کو دی کیوں کہ ایک پروڈیوسر نے کہانی سُننے کے لئے بُلایا ہے چونکہ لانڈری والے کو دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ اس لئے تولیہ باندھے

پھر رہا تھا۔
"آپ نے اسے پیسے دیئے۔
"کون سا قارون کا خزانہ دیا۔ مجھے تو بس یہ فکر ہے کہ بیچارے کا کام بننا چاہیے"۔
انھوں نے اپنے لئے کبھی نہیں سوچا۔
ماں جی اگر کہتیں۔" ناتھ تمھارے اگر ایک بچہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔" تو وہ فوراً بول پڑتے۔"
بھائی صاحب کے بچے۔ سرلا کے بچے۔ اوم کے بچے کیا میرے بچے نہیں ہیں۔؟ پھر ماں جی جس دور سے ہم گذر رہے ہیں۔ اس دور میں بچے پیدا کرنا گناہ ہے اپنے ساتھ بھی بچوں کے ساتھ بھی۔"
جب کبھی ان پر کڑکی کے دن آئے۔ میں کہتی بھائی صاحب آپ اپنے فلاں دوست سے کہئے آج کل لاکھوں کما رہا ہے آپ کو بھی کام دلوا دے۔"
وہ جواب دیتے۔" سرلا۔ اپنے بھائی کے سوا کسی سے نہیں کہوں گا کہ میرے پہ کیا گزر رہی ہے۔ پھر میرے عزیز دوستوں کو کیا دکھائی نہیں دیتا۔ کہ میرے پاس کوئی کام نہیں ہے۔؟
اس معاملہ میں مہندر جی بہت خوددار تھے۔ تکلیف سہہ لیتے تھے لیکن اُف نہیں کرتے تھے۔ لیکن دوسرے کی تکلیف ان سے سہی نہیں جاتی تھی۔ ایک بار مشہور شاعر میراجی سخت بیمار ہوگئے۔ ڈاکٹر نے کہا میراجی کی جان بچانے کے لئے خون کی سخت ضرورت ہے۔
" مہندر جی افسانہ نگاروں میں پہلے آدمی تھے جنھوں نے اپنا خون دے کر اس وقت میراجی کی جان بچائی تھی۔

مہمان نوازی ان کا دھرم تھا - ایمان تھا - کچھ ایسی باتیں انسان کی زندگی میں ہو جاتی ہیں جو بھولے سے بھی نہیں بھولتیں :

کوئی آٹھ نو سال پرانی بات ہے - میں دو ماہ سے بیمار تھی مہندر جی نے کئی خط لکھے - سرلا تم میرے پاس آجاؤ یہاں آکر تم ضرور ٹھیک ہو جاؤگی - متواتر اصرار کر کے انھوں نے مجھے اپنے پاس بلالیا - میرے دونوں بچے بھی میرے ساتھ تھے - مجھے وہاں جاکر پتہ چلا کہ مہندر جی کا کام مندہ ہے - کوئی نیا فلم لکھنے کا کنٹریکٹ ان کے پاس نہیں کہانیاں اور ناول لکھ لکھ کر وہ گذارہ کر رہے تھے - خالی لکھنے سے یہاں کسی کا پیٹ بھرا ہے - اس لئے مجھے بے حد شرمندگی کا احساس ہوا - میں دل ہی میں اپنے کو کوس رہی تھی کہ میں کیوں آگئی - یہ مہندر جی - کبھی یہ نہیں سکتے تھے کہ میں ان کے پاس رہ کر اپنا کچھ خرچ کروں -

انہیں دنوں ہمارے نزدیک کے ایک رشتہ دار بمبئی گھومنے چلے آئے - ٹھہرے تو وہ کہیں اور - لیکن ایک دن کوئی بیس آدمیوں کا قافلہ مہندر جی کے گھر آدھمکا - ان کی فرمائش ہوئی کہ انھیں کسی فلم کی شوٹنگ دکھائی جائے - کیوں کہ انھوں نے شوٹنگ نہیں دیکھی ہے -

مہندر جی نے بڑے پیار اور محبت سے ان کی فرمائش قبول کر لی - پہلے چلنے کے ساتھ انھیں مٹھائی سموسے پھل کھلائے پھر انھیں شوٹنگ دیکھنے کے بعد کھانے کی دعوت دے ڈالی -

مجھے بے حد رُلائی آئی - بھائی صاحب کو کیا لٹنے کا شوق چرایا ہے - ان رشتہ داروں نے تو انھیں کبھی ایک کپ چائے کا نہیں پوچھا اور یہ ان کی آؤ بھگت کئے جا رہے ہیں - لیکن مہندر جی کا کہنا تھا - " سرلا یہ کتنی آس سے کر میرے پاس آئے ہیں - مجھے اپنا سمجھ کر ہی تو یہ اتنا بے تکلف ہوئے ہیں - ورنہ کھاتے پیتے لوگ ہیں - کہیں اور بھی جا سکتے تھے - بھائی صاحب نے گرینڈ دعوت دی اور دعوت کے درمیان مہندر جی کے مذاق اور درگا بھابھی کے قہقہوں نے دعوت کو بڑا پُر لطف بنا دیا - میں نے سوچا مہندر جی لے کیسے اتنی کڑکی سے

دنوں میں روپوں کا انتظام کرلیا۔ صرف چند گھنٹوں میں۔ کیوں کہ ان دنوں کرشن جی انڈیا سے باہر گئے ہوئے تھے۔

لیکن صبح ہوئی تو میں نے دیکھا درگا بھابھی کے ہاتھ کا ایک کنگن کلائی سے غائب تھا میری سمجھ میں سب کچھ آگیا اور ایک دم میرا چہرہ اُتر گیا۔ پر مہندر جی اور درگا بھابھی کے چہروں پر کوئی شکن نہ تھی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ روشن تھے۔

"ایسی بھی کیا مہمان نوازی۔ کہ بیوی کا زیور تک بک جائے" میں نے مہندر جی سے کہا۔

"مہندر جی اور درگا بھابھی دونوں ایک سُر سے بول اٹھے۔ کنگن تو کبھی بھی بن سکتے ہیں لیکن یہ لوگ جس پیار اور بھروسے کا سہارا لے کر میرے گھر آئے تھے۔ جس گھڑی یہ سہارا ختم ہو جاتا سرلا میں اسی دن پوری طرح لٹ جاتا۔ مر جاتا۔ میں ایسے مرنا نہیں چاہتا۔ ایسا تھا میرا بھائی مہندر۔

ابھی پچھلے سال ۱۹۷۳ء میں انھوں نے بڑے بھائی صاحب پر ایک ڈاکیومنٹری بنائی۔ انھیں کشمیر اور پونچھ میں جا کر شوٹنگ کرنی تھی۔ وہ مجھے ریوتی جی کو میرے چھوٹے بھائی اوم کو خط پر خط لکھتے رہے کہ سب کشمیر چلنے کے لئے تیار ہو۔ وہ ساتھ ہیں یہ بھی لکھتے کہ تم لوگوں کے انکار کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ دیکھو اکٹھے جائیں گے تو مجھے بہت ہی اچھا لگے گا۔ جس جگہ اپنا بچپن اور جوانی گزاری ہے۔ اسے 37 سال کے بعد پھر دیکھنا نصیب ہو رہا ہے۔ نہ جانے آگے کبھی ایسے اکٹھے جانے کا موقع ملے یا نہ ملے۔

ریوتی جی نے لکھا کہ سرلا تمھارے ساتھ چلی جائے گی میں نہ جا سکوں گا۔ کیوں کہ انہی دنوں ریوتی جی کو بھارتیہ ناٹیہ سنگھ کی طرف سے روس جانا پڑ رہا تھا۔ مہندر جی نے لکھا "یار لگتا ہے تمھیں میرے ساتھ سے روس جانا زیادہ پسند ہے۔ دیکھو روس تو تم پھر بھی جا سکو گے۔ لیکن یہ ہم سب کا اکٹھے پونچھ جانا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ یہ کیا ان کی

بھوشیہ وانی تھی۔؟

کوئی 22 آدمیوں کا قافلہ لے کے وہ جموں کشمیر گئے تھے۔ انھیں جو ڈاکیومنٹری سے بچانا تھا وہیں ہم پر خرچ کر آئے اُلٹا قرضدار ہو گئے خرچ کی بات ہوتی تو کہتے۔ "خرچ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اور ہوتا ہی رہے گا۔ لیکن ہم سب بھائی بہن پریوار سمیت کبھی کشمیر کی وادی پونچھ کے دریا کے شفاف پانی اور اپنے اسکول کے ماسٹر کو نہ دیکھ پاتے۔ یہ پہاڑ یہ جنگل یہ چیڑ کے سنسناتے پیڑ یہ جھرنے بہت سندر کہانیاں کہتے ہیں۔ سرلا کوئی ان کی آواز کو پہچانے تو پتھر سے ہیرا بن جائے۔

کشمیر میں سب نے کچھ نہ کچھ لیا۔ مہندر جی اپنے لئے کچھ نہیں لیا۔ میں نے کہا بھائی صاحب آپ کم سے کم ایک مفلر ہی لے لیجئے، اور کچھ نہیں لینا تو" وہ بولے "نہیں سرلا۔ میں کچھ نہیں اپنے لئے خریدوں گا ـــــــ کیوں کہ بمبئی میں گرم کپڑے کی ضرورت ہی نہیں۔ بیکار ہیں اپنے لئے خریدنا۔ مجھے پسند نہیں۔"

کرشن جی کے اوپر ڈاکیومنٹری جن دنوں تیار ہو رہی تھی، وہ بے حد خوش تھے۔ میں اور ریوتی جی ان کے مرنے سے ایک ماہ پہلے ان کے ساتھ بمبئی میں بیس روز رہے اکثر کہتے۔ سرلا لگتا ہے دن پھرنے والے ہیں۔ تین چار پکچرز ہاتھ میں ہیں۔ من چلی (پکچر کا نام) بھی خوب چل رہی ہے۔ اور دیکھو دو تین ڈاکیومنٹری بنانے کا آفر آنے والا ہے۔ اب میری صحت بھی ٹھیک ہے۔ نہ زکام ہوتا ہے۔ نہ پیٹ خراب، ایک عجیب سی جو بے چینی تھی اب ختم ہو گئی ہے۔ یہ سب شراب اور سگریٹ چھوڑنے سے ہوا ہے سرلا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم کو سگریٹ اور شراب نہیں پینا چاہئے۔ اب میں نے چھ ماہ سے شراب اور سگریٹ بھی چھوڑ دیا۔ ایک دل ہی تو ہے میرے پاس۔ اس کی چنتا مت کرو۔ میں کہتی بھائی صاحب آپ کی کڈنی میں پتھری ہے۔ اس کا علاج ہونا چاہیئے سرلا ویسے یہ دنیا فانی ہے۔ مرنا سبھی کو ہے اب مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔"

"میں کہتی بھائی صاحب آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ آپ ۱۰۰ سال تک جئیں۔
"نہیں سرلا میں اتنا بڈھا ہو کر مرنا نہیں چاہتا۔ سچ پوچھو تو میں کام کرتے کرتے مرنا چاہتا ہوں۔ کسی کا محتاج ہو کر نہیں۔"

جب ہم واپس دہلی آنے لگے تو کہنے لگے تم اور ریوتی میرے پاس آتے ہو تو مجھے کتنا سُکھ ملتا ہے۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تم مجھے اس قدر چاہتے ہو۔ سچ مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ میں چھپرا بلڈنگ میں نہیں رہ رہا ہوں۔ بلکہ ایک عالیشان مکان میں رہ رہا ہوں۔ ارے اس محل کو بھی کیا کرنا، جہاں کوئی قدم رکھنے سے بھی ڈرے۔

اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تو بولے۔ "سرلا ایسے ہی آیا کرو۔ بڑی ہنسی خوشی سے یہ دن بیت گئے۔ اور بھائی صاحب نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ درگا بھابھی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں یہ میری مہندر جی سے آخری ملاقات تھی

پھر ایک ماہ میں ان کے ریوتی جی کے نام۔ میرے نام پانچ خط آئے۔ ریوتی جی کو اپنے اس نمبر کے بارے میں لکھتے۔ مجھے بھائی صاحب کی راضی خوشی اپنی صحبت کے بارے میں اور میرے بچوں کی خبر پوچھتے۔

۱۹ ر مارچ کو مجھے ان کا آخری خط ملا۔ جس میں لکھا تھا۔ کرشن جی ۲۰ ر مارچ کو دہلی پہنچ رہے ہیں۔ اور ۲۰ ر مارچ کو وہ بیمار پڑے اور ۲۰ ر مارچ کو ہی وہ چل بسے۔

مجھے بیماری کی خبر ملی مرنے کی نہیں۔ لیکن جب بمبئی کے اسٹیشن پر پہنچے تو عجیب سی ویرانی مجھے اسٹیشن پر دیکھنے کو ملی گو آدمیوں کی بھیڑ کا شور ویسے ہی تھا سب کچھ تو ویسا ہی تھا لیکن پھر بھی دن کے اجالے میں اداس اُداس شام گھر آئی تھی۔ میرے قدم اُٹھتے ہی نہیں تھے۔

"کوئی اسٹیشن پر نہیں آیا۔" میں ریوتی جی سے بولی۔

"سب ہسپتال میں ہوں گے۔ مہندر جی کے پاس۔

انھوں نے جھوٹ بولا۔ وہ سچ جانتے تھے کہ مہندر جی ہسپتال کیا۔ دُنیا میں نہیں ہیں۔ جس کو سے کو جا رہی ہوں اُجڑ گیا۔

سنجیدہ متین شخصیت

کسی ادیب کو یہ جاننے کے لئے ضروری نہیں کہ آپ اس کے دوست ہوں یا ہم پیالہ اور ہم نوالہ۔ کئی بار یوں ہوتا ہے کہ آپ سالہا سال سے ایک ادیب سے ملتے رہتے ہیں مگر اس کے اندرونی کرب سے ناآشنا رہتے ہیں۔ اسے جاننے اور پہچاننے کے لئے ادیبوں کی کتابوں کا پڑھنا بہت اہم ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کا شمار اس زمرے میں ہوتا ہے۔ وہ کم گو، سنجیدہ اور متین قسم کے انسان تھے۔ میں نے انہیں قہقہہ لگاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے دیکھا۔ گپیں ہانکتے ہوئے کبھی نہیں سنا۔ معقول اور سنجیدہ بحث کرتے ہوئے دیکھا۔ دراصل میری ان سے پہلی ملاقات لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں یعنی تقسیم ملک سے بہت پہلے۔ اس وقت تک میرے صرف پندرہ بیس افسانے اردو کے رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔ مکتبہ اردو لاہور کے مالک میرے افسانوں کا مجموعہ چھاپنے کے لئے مصر تھے۔ اور میں یہ چاہتا تھا کہ کسی نامور نقاد سے اپنی کتاب کا دیباچہ لکھواؤں۔ احتشام صاحب کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ دیباچہ انہیں سے لکھواں گا۔

احتشام صاحب کا قد لمبا تھا رنگ گندمی اور چہرے پر کافی داغ تھے۔ جسم دبلا نہ تھا۔ آنکھوں میں غور و فکر کی چمک تھی۔ عمر زیادہ نہ تھی۔ مگر جوانی کے ایام میں بھی وہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ ماتھے اور گالوں پر جو سلوٹیں تھیں۔ ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ احتشام صاحب نے اس

چھوٹی سی عمر میں زیادہ سوچا ہے۔ صرف اپنے لئے نہیں سوچا۔ دوسروں کے لئے بھی سوچتے ہیں۔ سوچنا ایک مشکل کام ہے۔ بہت ہی مشکل کام، خاص کر دوسروں کے لئے اور وہ بھی ان کی بہتری اور بہبودی کے لئے۔

احتشام صاحب نے کہانیاں لکھیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی اور ایک دو سفرنامے بھی۔ مگر شہرت ملی تو تنقیدی مضامین کی وجہ سے۔ وہ تنقید کے میدان میں شہسوار تھے۔ اس میدان میں ایسے نقش پا بنا گئے جو دوسروں کے لئے حرف آخر بن گئے۔

پہلی ملاقات فروئی رتھی۔

کہنے لگے۔ " میں نے آپ کو پڑھا ہے اور خاص کر آپ کا افسانہ " جہاں میں رہتا ہوں " بے حد پسند آیا۔ اس قسم کے افسانے اُردو ادب میں بہت کم لکھے گئے ہیں "

"اور اُن کا افسانہ " بغاوت " آپ نے نہیں پڑھا " سبط حسن نے چمک کر کہا۔

" پڑھا ہے۔ خوب ہے وہ افسانہ " احتشام صاحب یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

میں اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا اور کون نہیں خوش ہوتا اپنی تعریف سن کر۔ اور تعریف بھی احتشام صاحب کی زبان سے۔

میں نے احتشام صاحب کے تنقیدی مضامین پڑھے تھے۔ مجھے ان کا انداز بیان اور خاص کر ان کا مارکسی نقطہ نظر اور اعتدال پسند کا رجحان بے حد پسند تھا۔ وہ کسی ادیب کو نہ آسمان پر بٹھاتے تھے اور نہ ہی زمین پر لاکر پٹخ دیتے تھے۔ میں نے اپنی کتاب کے بارے میں ان سے گفتگو کی۔ انھوں نے دیباچہ لکھنا منظور کر لیا۔ میں نے سوچا۔ بغیر پڑھے لکھ دیں گے۔ جیسا کہ اکثر مشہور و معروف نقاد کرتے ہیں مگر جب انھوں نے مجھ سے میرا مسودہ لے کر اور ایک مہینہ اپنے پاس رکھ کر۔ دیباچے کے ساتھ واپس کیا۔ اور میں نے دیباچہ پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ احتشام صاحب نے واقعی میرے افسانوں کے مجموعے کو پڑھا ہے اور پڑھنے کے بعد میری خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی

کی ۔ ہر ادیب بذاتِ خود ایک نقاد نہیں ہوتا ہے ۔ میں اپنے افسانوں میں کردار نگاری کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور احتشام صاحب نے اسی خاصیت کو سراہا تھا ۔

دراصل میری احتشام صاحب سے زیادہ ملاقاتیں نہ ہوئیں ۔ اگر زیادہ ملاقاتیں ہو جاتیں جب بھی بات آگے نہ بڑھتی ، کیوں کہ میں بھی کم گو آدمی ہوں اور احتشام صاحب بھی اور جب دو آدمی کم گو آپس میں مل جائیں تو اظہار گفتگو کا راستہ سوائے خاموشی کے اور کیا ہو سکتا ہے ہاں کبھی کسی کانفرنس میں یا کسی اور میٹنگ میں ملاقات ہو جاتی تو مندرجہ ذیل جملوں کو دہرایا جاتا :-

"آداب عرض ! احتشام صاحب !"

"آداب ۔ آپ کیسے ہیں ؟" احتشام صاحب پوچھتے ۔

"بس ٹھیک ہوں جی ۔"

"کرشن جی کیسے ہیں ؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں ۔"

ان جملوں سے آگے کبھی گفتگو نہ بڑھی ۔ میں نے ان مختصر سی ملاقاتوں میں ایک چیز کو شدت سے محسوس کیا کہ احتشام صاحب صرف کم گو انسان ہی نہیں ۔ وہ صرف سنجیدہ ہی نہیں رہتے بلکہ اداس بھی رہتے ہیں ۔ یہ اداسی کوئی ذاتی اداسی نہ تھی ۔ کسی (FRUSTRETIAN) کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس اداسی کی وجہ بڑی گہری تھی ۔ جو لوگ ضرورت سے زیادہ ذہین ، دیانت دار اور مخلص ہوتے ہیں اور جب وہ اپنے اِردگرد ایک اپنے دل کو دیکھتے ہیں جو بے حد گھٹیا ، گندا اور قابلِ نفرت ہوتا ہے تو ان کے دل میں ان حالات کو بدلنے کی تمنا ہوتی ہے اور جب یہ نظامِ زندگی ان سے بدلا نہیں جاتا تو یہ ذہنی کرب ایک مستقل اداسی کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔

اور شاید یہی کچھ احتشام صاحب کے ساتھ ہوا ۔ اگر آپ نے احتشام صاحب کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اعلیٰ پایہ کے مارکسی نقاد تھے بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مارکسی تنقید کا آغاز انھوں نے کیا اردو ادب میں ۔ وہ مارکسی قدروں کے علمبردار تھے ۔

انھوں نے ترقی پسند ادب کو اسی کسوٹی پر پرکھا۔ اور ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیبوں کو سراہا۔ جی ہاں وہ ایک Committed نقاد تھے۔ وہ پکّے مارکسی تھے۔ انھوں نے ادب کا رشتہ عوام سے جوڑا۔ اور صاف اور سیدھے لفظوں میں بتایا کہ ادب محض انسانوں کی تفریح کے لئے نہیں لکھا جاتا۔ بلکہ عظیم ترقی پسند ادب ملک کے حالات کو بدلتا ہے۔ اس قسم کا ادب بین الاقوامی رشتوں کو استوار کرتا ہے۔ ذات پات مذہب رنگ اور نسل سے اُوپر اُٹھ کر سارے کرۂ ارض کے افسانوں کے لئے ایک درسِ حیات دیتا ہے جس سے عوام کی اقتصادی بدحالی، آپس کی منافرت اور دیگر مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے عوام کے اندر ایک جذبہ پیدا کر کے جس سے ان کے اندر لڑنے کی قوت پیدا ہو، تاکہ وہ ایسے نظام کی داغ بیل ڈال سکیں جس سے صرف ایک انسان کا بھلا نہ ہو بلکہ تمام انسانوں کی بہتری ہو۔ احتشام صاحب نے اردو شاعری اور افسانوں پر تنقید کرتے ہوئے نئی قدروں کو اجاگر کیا اور اسی قسم کے ادب کو سراہا۔ احتشام صاحب ادیب ہی تو تھے۔ انقلابی قدروں کا پرچم بلند تھے۔ انقلاب نہیں آیا تو ادیب کیا کرے۔ جب اندرونی درد پر ضبط لگائے رہتے ہیں تو چہرے پر ایک اداسی آہی جاتی ہے اور اس اداسی سے شکست کا اعتراف نہیں تھا۔ بلکہ علم و فن سے بہرہ ور ہوتے ہوئے یہ اداسی اس کیفیت کی غماز ہے۔ جب ادیب اس منزل پر پہنچ جاتا ہے اور اسے اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ انسان نے چاند پر کمندیں پھینک دی ہیں۔ ایٹمی طاقتوں کو اپنے بس میں کر لیا ہے، جس کی وجہ سے اگر وہ چاہتے تو ساری دنیا کے لوگوں کو خوش حال بنا سکتا ہے مگر ابھی تک انسان کی بنیادی فطرت نہیں بدلی۔ وہ خود غرضی، کینہ پروری صرف اپنی قوم کی بہتری، رنگ اور نسل کے جھگڑے، گورے اور کالے کا فرق اور اسی قسم کی بے شمار لعنتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اسی لئے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انسان ابھی تک بامِ عروج تک نہیں پہنچ سکا، جہاں اسے پہنچنا چاہیئے۔ وہ ایک ایسا نظام زندگی اس کرۂ ارض پر منطبق نہ کر سکا جس سے یہ دنیا رشکِ جنت بن سکے۔ دُنیا کو رشکِ جنت بنانے کی تمنّا۔ ایک حساس ادیب کے دل میں ایک خنجر کی طرح پیوست رہتی ہے اور احتشام صاحب

کے دل میں اسی قسم کا ایک خنجر پیوست تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک خوشگوار اداسی ٹپکتی رہتی۔

بمبئی کی ہنگامہ خیز زندگی میں کبھی کبھی ادبی محفلوں کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ ایسی ایک ادبی محفل میں جہاں پروفیسر احتشام حسین کو مدعو کیا گیا، تاکہ وہ مشہور نقاد اور شاعر حالی کے بارے میں لکچر دیں۔ مجھے بھی اسی قسم کی ایک مجلس میں بحیثیت صدر بلوایا گیا۔ یہیں پر احتشام صاحب سے میری ملاقات ہوئی اور وہی جملے دہرائے گئے۔ آداب عرض۔ آپ کیسے ہیں۔ میں ٹھیک ہوں اور کرشن جی بھی، احتشام صاحب مسکرا دیئے اور کہنے لگے۔ آپ نے میرا جملہ دہرا دیا۔

میں نے اسی مجلس میں احتشام صاحب کے بارے میں ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ جس میں ان کے خلوص، پیار، ادبی لگاؤ، اور مارکسی نقطۂ نظر کے بارے میں روشنی ڈالی۔ اس تقریر کے بعد احتشام صاحب نے حالی کے بارے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ اس دن پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ احتشام صاحب گفتار کے غازی ہیں۔ تقریر اتنی صاف ستھری، سنجیدہ تشبیہوں اور استعاروں سے آراستہ، علم وفن کے موتی بکھیرتے ہوئے، حالی کی ادبی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے، ان کے تنقیدی سرمائے اور شعری حسن پر نظر رکھتے ہوئے اور خاص کر اس وقت کی دقتوں اور مشکلات کو مدِ نظر رکھ کر حالی نے کس طرح اُردو ادب کو ایک نیا نقطہ عطا کیا یہ حالی کی بہت بڑی دین تھی۔ تقریر تھی کہ لفظوں کا ایک جم غفیر، خوب صورت، سلیس، بامعنی، باوقار، پُرشکوہ اور دل میں اترنے والے لفظوں کی یلغار تھی۔ تقریر میں ایک سحر تھا۔ آواز میں بے پناہ جادو۔ جس کا تعلق سننے سے تھا اسے بیان نہیں کیا جا سکتا اس تقریر کے بعد سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ احتشام صاحب ایک ثمر بار ٹہنی کی طرح جھک گئے۔ ان کی نگاہوں میں نہ رعونت تھی نہ نخوت بلکہ اس اعزاز سے وہ جُھکے جا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غرور نہ تھا بلکہ احسان مندی کی ایک نمی سی تھی۔

بحیثیت مارکسی نقاد کے بھی ان سے مرعوب تھے۔ اس دوران میں ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک پر کئی وار کیے گئے۔ کئی ادبی زلزلے بھی آئے۔ کئی ادبی جمود نے سر نکالا۔ اور جب ادبی جمود ٹوٹا تو جدیدیت نے سر ابھارا۔ کئی نقادوں نے وقتی شہرت کی خاطر جدید ادب کو سر پر بٹھایا لیکن احتشام صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ کیسا غوغائے عظیم تھا۔ تنہائی، ذاتی غم، اپنی ذات کے بارے میں ہمیشہ آنسو بہانہ، خودکشی اور گھٹیا قسم کی جنسی کہانیاں لکھنا۔ اس قسم کے موضوعات اب عام سے ہو گئے۔ افسانے اور شعری ادب دن بدن مہمل ہوتا جا رہا تھا۔ زیادہ تر ادیب مغربی ادب کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ نئی پود نے بے راہ روی اختیار کرلی۔ پرانی روایتوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ جس دائرے میں اردو شاعری پروان چڑھ رہی تھی اور جس کی وجہ سے میر، غالب، اقبال اور فراق جیسے عظیم الشان شاعروں نے اپنی تخلیقات سے اردو کے شعری ادب کو مالا مال کیا۔ اس ادب کے خلاف نئے ادیب برسرپیکار تھے احتشام صاحب نے اس افراتفری، اس بے راہ روی کے خلاف آواز بلند کی اور کھل کر کہا۔

ادب بے ادبی کا نام نہیں۔ ادب صرف ذاتی غم، تنہائی، ذاتی اداسی کا نام نہیں ادب جنسی بے راہ روی کا نام نہیں۔ ادب صرف روایتوں کو توڑنے کا نام نہیں۔ ادب ابہام کا نام نہیں۔ ادب مہمل نہیں ہوتا۔ ادب تہذیب و تمدن سکھاتا ہے۔ ادب ایک بہتر زندگی کی نشان دہی کرتا ہے۔ ادب ذہنی کرائیس میں ایک توازن پیدا کرتا ہے۔ ادب روشنی اور علم سے لوگوں کو مالا مال کرتا ہے۔ ادب تفریق کو مٹاتا ہے۔ محبت کرنی سکھاتا ہے۔ نفرت مٹاتا ہے۔ ادب ذریعۂ نشاط ہے انسان کے لیے۔ ادب احساس حسن اور ذوق جمال کی تربیت کرتا ہے۔ ادب انقلاب لاتا ہے۔ ادب افراتفری کا سرچشمہ نہیں۔ ادب ہیجان نہیں۔ ادب تخریبی عناصر کو بڑھاوا نہیں دیتا بلکہ تعمیر کی جانب بڑھتا ہے۔ احتشام صاحب نے اپنے تنقیدی مضامین میں انہی قدروں کی نشان دہی کی ہے۔

احتشام صاحب کتابوں کے عاشق تھے۔ لکھنا اور مطالعہ کرنا۔ بلکہ لکھنا کم اور مطالعہ زیادہ کرنا ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا ان کے تنقیدی مضامین ۔ اردو تنقید میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ انھوں نے انہی قدروں کا پرچم بلند کیا ۔ جن کی قیادت آج کل شری متی اندرا گاندھی کررہی ہیں ۔ آج پھر سے ترقی پسند ادب اور ترقی پسند سیاست آپس میں گلے مل رہے ہیں ۔ آج سے چالیس برس پہلے جس سماج کی داغ بیل، ترقی پسند ادیبوں نے ڈالی تھی اور ایک نئے سماج کو جنم دینے کے لئے انھوں نے افسانے ، غزلیں، نظلیں اور تنقیدی مضامین لکھے تھے اور آج تک لکھتے رہے ہیں ۔ ان میں احتشام صاحب کی آواز سب سے زیادہ سنجیدہ ، بھرپور، مارکسی نقطۂ نظر سے لیس ہوکر ابھری اور تنقیدی ادب پر اپنی مہر ثبت کرگئی جو ہمیشہ امر رہے گی ۔

ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ جس شخص نے فنِ تنقید کو ایک نئی زندگی بخشی ، مارکسی فلاسفی سے آگاہ کیا اور مارکسی تنقید کو کہکشاں کی بلندی اور شستہ رنادی اور ایک ایسی مضطرب روح عطا کی جو عوام کی بہتری کے لئے ہمیشہ تڑپتی رہے گی ۔ انھیں نہ پدم شری سے نوازا گیا اور نہ انھیں (INDO - SOVEIT) ایوارڈ دیا گیا۔ جس کے وہ یقیناً مستحق تھے ۔ کاش وہ دانشور اور سیاست داں جو اس قسم کی کمیٹیوں کو سنبھالے ہوئے ہیں وہ ایک لحہ کے لئے سوچیں کہ انھوں نے کیوں اتنی بڑی غلطی کی ۔ اب بھی وقت ہے کہ احتشام صاحب کی یاد میں کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے آنے والی نسلیں ان کی ادبی تخلیقات سے مستفید ہوتی رہیں ۔

حنائی اُنگلیاں

کیا کرتے ہو راجندر بھیا ــــ ؟ کچھ نہیں بی اے پاس کر چکا ہوں ۔ اب کیا کر رہے ہو؟ ایم اے کی تیاری کر رہا ہوں ـــــ ۔ پھر کیا کرو گے بی اے کا امتحان پھر دوں گا ۔ ـ آہا ــــ آہا ـــــ آہا ــــ ہاہاہاہا ــــ

سالی نوکری نہیں ملتی ۔ بہت کوشش کر چکا ہوں ۔ جھوٹ بکتے ہو ۔ رات دن گھر میں رہتے ہو ۔ اور اپنے ماں باپ کا خزانہ خالی کر رہے اور پھر کہتے ہو بہت کوشش کر چکا ہوں ۔ تم کیا کوشش کرو گے ۔ تم میں کام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ۔ تم کام کر ہی نہیں سکتے ۔ جو کام کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ کام لے آتے ہیں ــــ تم کاٹھ کے اُلّو ہو ۔ تُم کیا کرو گے ۔ بوٹ پالش کرو بوٹ ــــ سُنا تم نے ــ کیا کبھی کسی سے ملنے گئے ــــ کسی کی سفارش حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے ــــ کسی کے ہاں جوتیاں چٹخائیں ۔ کسی کے لڑکے کو مُفت پڑھایا ۔ کسی کی چاپلوسی کی ، کسی کی تعریف میں قصیدے پڑھے ۔ اور پھر کہتے ہو بہت کوشش کر چکا ہوں ، جاہل بے وقوف ــــ کیا نوکری اس طرح ملا کرتی ہے ۔ آج کل کے لڑکے کام تو کرتے نہیں ۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ بیٹھے بٹھائے کوئی کام مل جائے ، ہزاروں کی تھیلی ہاتھ میں آجائے اور پھر وہ گلچھرے اڑائیں ۔ ناک سے دھواں نکالیں ۔ سینما دیکھیں اور نسبت روڈ پر لڑکیوں سے دل لگی کریں ۔ بدمعاش ۔ شہدے کہیں کے ۔

میری طرف نہیں دیکھتے ، سُوکھ کر کانٹا ہو گیا ہُوں ۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے ۔ بے کس

طرح ہوا ۔کیوں کر ہوا ۔ ہماری طرح ہی تھا ۔ موٹا ـــــ تازہ ـــــ آنکھوں میں چمک تھی ۔ جسم گوشت سے بھرا ہوا تھا ـــــ چہرے پر دلآویزی تھی ـــــ کیا مر گئی ؟ ـــــ کیا گیا ـــــ ؟ جونک پی گئی ! ـــــ کہا نہ تھا ۔ محنت کرو خوب دل لگا کر پڑھو ـــــ ایم اے میں سیکنڈ ڈویژن لو ۔ تم کیا جانو نوکری کس طرح ملتی ہے ۔ جاؤ ڈنڈ پیلو ، اکھاڑے میں جاؤ ۔ مالش کرو ـــــ آئے پڑھنے اور پھر کہتے ہو نوکری نہیں ملی ـــــ

کام کرنے سے نوکری ملتی ہے ۔ میاں ! پروین گھوش کی طرح ۔ آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں ۔ چھاتی دکھتی ہے ـــــ پھیپھڑوں سے خون آتا ہے ۔ گورنمنٹ نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے ۔ اور ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ دے گی ۔ سولن جا رہے ہیں ۔ ایسے نوکری ملتی ہے ـــــ

تمھیں تپ دق چاہئے ـــــ یا نوکری ـــــ آہا ـــــ آہا ـــــ اوہ ـــــ ہو ـــــ تپ دق جاؤ ـــــ سولن وارڈ میں رہو ۔ اور لوگوں سے پوچھو کہ انھیں کیوں تپ دق ہو گیا ـــــ وٹامن کھانے کو نہیں ملتا ـــــ دودھ پینے کو نہیں ملتا ۔ اور صاف ہوا سانس لینے کو نہیں ملتی ، نوکر ہو کر کیا کرو گے ۔ شادی کرو گے ۔ کیا تمھیں دنیا میں اور کوئی کام نہیں ۔ نوکری کے بعد شادی عورت ـــــ عورتیں تو بازار میں پھرتی ہیں ۔ کسی ایک کو پکڑ لو ـــــ ارے جونیوں سے ڈرتے ہو ، جوتیوں سے یا موت سے ۔ مرے اللہ غلام بھی کوئی نہ ہو ـــــ عورت سے ڈرتے ہو ۔ غلام کہیں کے ۔ آزادی نہیں ملتی ، ملے کیوں کر ـــــ اچھا آؤ ۔ ایک اور راستہ دکھاؤں ، جاؤ اس بازار میں جہاں عورتیں بکتی ہیں ۔ کچھ گئے ، میں کئی بار گیا ہوں ، جب تک شادی نہیں کی تھی ، ہر روز جاتا تھا ۔ ارے کیا کہا سوزاک ، سوزاک سے ڈرتے ہو ، ربلی کا دواخانہ موجود ہے ، کویراج شاماداس موجود ہے پاگل ! خود میرے پاس ایک مجرب نسخہ ہے ۔ ایک دن میں پیپ جلن بند ۔ ایک بار مجھے بھی ہوا تھا ۔ سنا تم نے ، سوزاک نہیں ، آتشک ، کچھ بھی نہیں ہوتا ـــــ خون خراب ہو جاتا ہے جسم پر پھوڑے نکل آتے ہیں ۔ اور پھر ـــــ پھر ـــــ علاج کراؤ تو مکتی مل جاتی ہے ۔ کتنا سہل طریقہ ہے مکتی حاصل کرنے کا عورت کے ذریعے مکتی ۔

✣

کیا کہا کوڑھ ہو جائے گا۔ کوڑھ سے ڈرتے ہو۔ ارے میاں تم بہت ڈرپوک ہو، ہر روز جذامیوں کو راستے میں لیٹے ہوئے دیکھتے ہو اور پھر بھی ان سے ڈرتے ہو۔ میں سمجھ گیا تم عورت سے ڈرتے ہو۔ تم نروان حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ میں —— میں —— چھ بچوں کا باپ ہوں۔ اور بچوں کو میں نے آتشک دیا ہے۔ ایک کی آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں اور دوسرے کی ٹانگیں، ٹیڑھی ہو گئی ہیں۔ اور میری بیوی کو بھی آتشک ہو گیا ہے۔ لائلپورے کر گیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کہنے لگی۔

تم اچھی لڑکی ہو۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ سارا تمہارے خاوند کا قصور ہے وہ بدمعاش ہے۔ تم مت رو۔ اچھا ہو جائے گا۔ خدا غارت کرے اس لیڈی ڈاکٹر کو۔ ارے میری بیوی کو اچھا کر دیا کیوں —— مجھے اپنی بیوی سے نفرت ہے کتنی بدصورت ہے میں ایک آرٹسٹ ہوں، مجھے خوبصورتی پسند ہے، خوبصورت عورتیں، گول گول مکھن کی طرح سپید بازو۔ دلکش نکھری ہوئی رنگت، آنکھیں جیسے۔ کیا کہا۔ کوئلے کی طرح کیا کہا۔ مر گئی —— نہیں نہیں۔ میری بیوی زندہ ہے اور میں بھی زندہ ہوں لیکن پھر بھی اس بازار میں جاتا ہوں، جہاں عورتیں بکتی ہیں، اجناس کی طرح، تم کہتے تھے، کہ جانا بند کر دیا —— جھوٹ بکتا تھا۔ مجھے حسن چاہئے۔ خوبصورت عورتوں کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

کیا کہا آس پاس کے گلی کوچوں میں۔ ارے بھئی نہیں —— شریف آدمی پھانس سکتے ہیں۔ میں رات کے اندھیرے میں جاتا ہوں۔ لوگ رات کو جاتے ہیں۔ میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ کیا کہا۔ رات کو جاؤں۔ ہاں سمجھ گیا تمہاری چالاکی۔ دفتر سے نکلوانا چاہتے ہو اور میری جگہ حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کبھی نہیں، میں دن کو جاؤں گا۔ رات کو بدمعاش جاتے ہیں۔ میں شریف ہوں۔ میں نے شادی کی ہوئی ہے۔ میرے بال بچے ہیں۔ میں دن کو جاتا ہوں۔

٭

اوہ —— تم نے مس شمسی نہیں دیکھی، خدا کی قسم —— نری مورت ہے، سونے کی مورت۔ تم کیا جانو —— اس میں کتنی کشش ہے، اس کی گول گول باہوں میں کتنی لطافت ہے، اس سپید سپید —— مرمریں ہاتھوں میں کتنا سکون ہے۔ اور پھر مس جلو —— اُف اُس کی

آنکھیں تیر کی طرح کلیجہ میں پیوست ہوجاتی ہیں۔ اور ہاں یاد آیا مس بانو ــــ خدا اس کی عمر لمبی کرے
ارے دیکھو لوٹ پوٹ ہوجاؤ۔ اسے مجھ سے کتنی محبت ہے۔ بے انداز محبت ــــ ایک دن میں
اس کے کوٹھے پر ایک ہفتے کے بعد گیا۔ کہنے لگی میں تجھ سے محبت کرتی ہوں، حرامزادے تو ــــ
تو دوسری رنڈیوں کے پاس جاتا ہے۔ بتاؤ مجھ میں کیا کمی ہے۔ کیا تم مجھے حیوان سمجھتے ہو۔ کیا میں
محبت نہیں کرسکتی۔ کیا میں جذبات سے مبرا ہوں، کیا میں محسوس نہیں کرسکتی۔ حرامی، گدھے، میں
کتنے عرصے سے تیرے فراق میں گھل رہی ہوں۔ آج چڑھا ہے میرے ہاتھ ــــ میں تمھیں خوب
پیٹوں گی ــــ کیوں جاتے ہو کسی کے گھر، بولو، کہو، نہیں نہیں۔ معاف کردو۔ اب کبھی نہ جاؤں گا۔
اب کہیں نہ جاؤں گا۔ اب معاف کردو۔ لیکن اس نے میرا بوٹ چھپا لیا۔ اور کہنے لگی جاؤ ــــ مردود
ــــ بے حیا ــــ دوسری رنڈیوں کے پاس جاتا ہے۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔
خدارا ــــ کیوں دفتر سے نکلواتی ہو۔ کہاں جاؤں ننگے پاؤں، ننگے سر کسی نے دیکھ لیا تو ــــ کہہ
دینا کہ پاگل ہوگیا ہوں۔ حیوان ہوں۔ کیا کہا ــــ میں پاگل ہوں۔ کیا میں پاگل ہوں، میں بالکل پاگل
نہیں، ہجڑا ہوں، ہجڑا۔ نہیں ــــ نہیں ــــ نہیں میرے چھ بچے ہیں۔ مجھے کون ہجڑا
کہتا ہے، میں چھ بچوں کا باپ ہوں۔

٭

اور میں بھول گیا۔ تم بھی چلو گے، ارے بھئی ایک اور پرانی واقف کار آئی ہے بالکل نئی،
راولپنڈی سے آئی ہے، دیکھو تو تڑپ اُٹھو۔ کانوں میں چمکتے ہوئے آویزے۔ باہوں میں سبز
رنگ کی چوڑیاں اور بدن پر سرسراتی ہوئی آسمانی رنگ کی ساڑی۔ کاش تم اسے دیکھ سکو۔ اوہ تم
بازار جانے سے ڈرتے ہو۔ عورتوں سے۔ مردوں سے۔ بڑے آدمیوں سے۔ بچوں سے اور
اپنے آپ سے بھی۔ چلو میرے ساتھ۔ اس نے ایک محلہ میں جگہ لی ہوئی ہے۔ میں ہر روز وہاں
جاتا ہوں۔ کوئی پوچھتا ہے تو کہتا ہوں کہ میرے رشتہ دار کا گھر ہے، میرے ماموں کی لڑکی رہتی ہے،
میری سالی رہتی ہے۔ ہنس رہے ہو۔ کیا کہا ــــ روپیہ نہیں ــــ پاگل چوری کرو۔ ڈاکہ

ڈالو۔ پولیس سے ڈرتے ہو۔ ارے ارے ہر آدمی سے ڈرتے ہو۔ تم تو خوف سے بھی خوف کھاتے ہو۔ کیا کہا ـــــ بیماری بیماری سے ڈرتے ہو۔ ڈاکٹروں سے ڈرتے ہو۔ اُٹھو چلو بھی۔ کتنے عرصے سے تمھارے یہاں بیٹھا ہوا ہوں، کچھ تو خیال کرو۔ دُنیا دیکھ لو۔ میاں ارے ارے رو رہے ہو۔ بیماری ـــ بیماری اتنا بھی کیا ڈر۔ دیکھو میں بھی بالکل تندرست ہوں صحت مند ہوں۔ کیا ہوا۔ کہ جسم پر گوشت نہیں۔ کیا ہوا کہ ایک قلم کی طرح دُبلا پتلا ہوں۔ دیکھ سانس برابر آ جا رہا ہے۔ ہر روز روٹی کھاتا ہوں اور تم کیا کرتے ہو۔ دن رات گھر پہ پڑے رہتے ہو۔ مکھیاں مارتے ہو۔ ہوش کی دوا کر۔ راجیندر بھائی۔

❖

گھر گھر ـــــ میاؤں میاؤں، کون بول رہا ہے۔ اختر بھائی۔ بلیاں۔ بلیاں ارے چوہے کہاں ہیں، ارے چوہے کہاں ہیں! وہ تم یہ بھی نہیں دیکھتے۔ تمھارے سامنے۔ تمھارے آگے۔ تمھارے دائیں بائیں۔ اُوپر نیچے۔ ہر روز دیکھتے ہو، گلیوں میں، بازاروں میں، ارے ۳۵ لاکھ چوہے ہیں ـــ آہا ـــ آہا ـــ بی ـــ بی ـــ بی ـــ ۳۵ لاکھ چوہے ہیں۔ ؟ ارے بلیاں کدھر گئیں۔ وہ دیکھو سامنے۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ کہاں ہیں، دکھائی نہیں دیتیں۔ ارے بلیاں کہاں ہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ کھا جائیں گی۔ کھانے دو۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ کہاں ہیں، دکھائی نہیں دیتیں۔ ارے بلیاں کہاں ہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ کھا جائیں گی۔ کھانے دو۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ مجھے کوئی نہیں کھا سکتا۔ ۳۵ لاکھ چوہے آہا ـــ آہا ـــ بی ـــ بی ـــ بی ـــ

کیا کہا کیا کہا اختر بھائی۔ ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں ادیب ہوں۔ نہایت حساس واقع ہوا ہوں، لوگوں کو دیکھ کر مجھے رونا آتا ہے۔ تمھاری صورت دیکھ کر بھی، ارے تمھیں کیا ہو گیا۔ آج کچھ نہیں کھایا۔ کچھ تو کھا لو۔ پانی پی لو ـــــ اختر بھائی ٹھنڈا پانی۔ ہندو پانی مسلم پانی۔ کونسا پانی پیو گے۔ پانی پی لو اختر! سن سٹروک نہیں ہو گا۔ لو نہیں لگتی۔

⁂

ہاں میں ادیب ہوں ۔ کہانیاں لکھتا ہوں ، شعر کہتا ہوں ۔ ارے دیکھتے نہیں مزدوروں کی حالت کتنے مضمحل اور افسردہ نظر آتے ہیں ، چہرے پر رنگت نہیں ، لب مُسکراہٹ سے عاری ۔ اور کیا کہا ـــــ زندگی بے کیف ، بے مزا ۔ ہر وقت کا رونا ۔

کہانیاں لکھتا ہوں ، میں ترقی پسند ادیب ہوں ۔ مزدوروں پر شعر کہتا ہوں ۔ لوگ سُنتے ہیں تو سر دُھنتے ہیں واہ بھئی واہ ۔ خوب لکھا مزدور کا کلیجہ نکال دیا ۔ اب بھیجا باہر نکالو ـــــ کیا کہا ـــــ کیا ملتا ہے ۔ ارے مزدور کو کیا ملتا ہے کہ ان پر لکھنے والوں کو کچھ ملے ۔ مزدور بھی فاقے کرتے ہیں اور ہم لکھنے والے بھی ترقی پسند ـــــ ارے نام ہوتا ہے عوام میں مشہور ہو گیا ہوں ۔ یہ کون جا رہا ہے ۔ ترقی پسند ادیب ـــــ ارے اس کی حالت ـــــ چہرے کی رنگت زرد ـــــ گال اندر کو پچکے ہوئے ۔ گردن سوکھی ہوئی ۔ چال ڈھال میں مردنی ۔ آنکھوں میں حسرت اندھا کیا جانے بسنت کی بہار ۔ میں مزدور بننا چاہتا ہوں ۔ ایک نئے ادب کی تخلیق کرنا چاہتا ہوں ۔ جب تک میں ان کی طرح زندگی بسر نہ کروں ۔ ان کے احساسات ان کی امنگوں ان کی زندگی کی ترجمانی کس طرح کر سکتا ہوں ۔ میں مزدور بن رہا ہوں ۔ ہر روز ـ ـ ـ دن بدن ـــــ کیا کہا ۔ تپ دق ہو جائے گا ۔ ہونے دو ۔ مجھے پروا نہیں ۔ میرا نام روشن ہو جائے گا ۔ مزدوروں کا ترجمان ۔ ان کا واحد نمائندہ ـ ـ آج مزدور اکٹھے ہوں گے ۔ کہاں ـ موچی دروازے کے باہر ـــــ دُنیا کے مزدور اکٹھے ہوں گے ۔ دُنیا کے مزدور اکٹھے ہو جاؤ تمھارے لیے کچھ نہیں بنے گا ۔ صرف زنجیریں بنیں گی ۔ کیا کہا ۔ دُنیا کے مزدو اکٹھے ہوں گے ۔ موچی درو کے باہر ـــــ ارے کون بھونک رہا ہے ۔ کُتا ـــــ نہیں ـ ـ نہیں اُلو ـ ارے اُلو تو رات کو بولتے ہیں ۔ یہ کل جُگ ہے ۔ آج کل دن کو اُلو بولتے ہیں

⁂

ہاں ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے مجھے اپنی بیوی پسند ہے ۔ اور تمھیں اختر بھائی ۔ اوہ ۔

تم نے تو شادی بھی نہیں کی کیا کہا۔ میری بیوی بدصورت ہے۔ تو کیا ہوا ــــ مجھے اس کی انگلیاں پسند ہیں۔ تم نے اس کی انگلیاں نہیں دیکھیں۔ وہ ہر روز پالش کرتی ہے۔ بوٹ پالش نہیں۔ ناخنوں کی پالش ارے ہر روز حنائی انگلیاں۔ خوبصورت دل کو لبھانے والی۔ اور پالش کے بعد ایسی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے سونے کی قاشیں۔ ارے سونے کی قاشیں تو ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ ان میں خون کھولتا ہے۔ نرم اور گرم ہاتھ۔ مخروطی انگلیاں۔ چغتائی کا شاہکار۔ کیا کہا۔ کام کون کرتا ہے۔ میری بیوی تو بہ توبہ۔ میری بیوی ....کیوں کام کرے۔ ارے نوکر۔ اتنی ہمت نہیں۔ کہ نوکر رکھ سکوں۔ ٹھیک کہا۔ تم بہت سیانے ہو۔ کالے کوے کی طرح۔ میرے دل کی بات جان لیتے ہو۔ اس کی ایک ساس ہے وہ کام کرتی ہے دن رات۔ میاں تمھاری کیا لگی۔ میری بیوی کی ساس۔ میری کیا لگی ٹھہرو۔ سوچ کر بتاتا ہوں۔ ہاں یاد آیا میری کچھ بھی نہیں۔ لے میری بیوی کی ساس میری کیا لگی۔ دن رات وہ کرتی ہے۔ بہت اچھا کام کرتی ہے۔ دن رات برتن صاف کرتی ہے۔ فرش صاف کرتی ہے۔ جھاڑو دیتی ہے۔ روٹی پکاتی ہے۔ گھر کا سارا کام میری بیوی کی ساس کے سپرد ہے۔ ایک دن بڑھیا کہنے لگی تمھاری بیوی کام نہیں کرتی۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ خوب کہا۔ ایسا ہی کرنا چاہئے۔ کہتی ہے میری بیوی کام نہیں کرتی ہے۔ برتن صاف نہیں کرتی،، کھوسٹ بڑھیا نہیں جانتی۔ اگر حنائی انگلیاں برتن صاف کرتے کرتے خراب ہو جائیں۔ تو بتاؤ میری بیوی کی حنائی انگلیاں بدنما ہو جائیں تو اس کا کون ذمہ دار ہوگا۔ میں کس کے سہارے زندہ رہ سکتا ہوں۔ کیا کہا۔ سارا کام بڑھیا سے لیتا ہوں۔ کیا وہ انسان نہیں۔ ارے وہ انسان بڑھیا۔ ۶۰ سال کی وہ بڑھیا۔ چلنے پھرنے سے وہ عاری۔ ہاتھ کانپتے ہوئے۔ کہتی ہے منہ سے پیپ آتی ہے۔ دانت ہلتے ہیں۔ مسوڑے خراب ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر کو بلالاؤ۔ دانت نکلوا دو سارے میاں۔ جہاں خون ہوتا ہے وہاں سے پیپ بھی آسکتی ہے۔ اور ساٹھ سال کی عمر میں پیپ نہ آئے۔ شہد نکلے گا کیا ــــ کہتی ہے مروں گی نہیں۔ تمھارا کام کروں گی۔ سو سال تک زندہ رہوں گی۔ مرنے میں نہیں آتی۔ اتنا کام دیا ہوا ہے۔ پھر بھی مرنے میں نہیں آتی۔ کتنی سخت جان ہے۔ مجھے اپنی بیوی کی۔ انگلیاں پسند ہیں۔ نہایت خوبصورت اور حسین۔ ریشم کے تاروں سے زیادہ ملائم بھلا وہ برتن کیوں صاف کرے۔ انگلیاں

بدنما ہو جائیں تو میں کیا کروں گا۔ اختر بھائی ـــــ تم مجھے کوستے ہو۔ بتاؤ میں کس کے سہارے جی سکتا ہوں۔ یہی تو میرا زندگی کا سرمایہ ہے مگر یہ مٹ جائے تو پھر ـــــ میں ادیب ہوں۔ نہایت حساس ہوں۔ بڑھیا کام کرے اور خوب کرے .... اور وہ حنائی اُنگلیاں ....

کیا کہا۔ ارے بولو۔۔ بھی میرے کان تو بہرے نہیں ہیں۔ گو دماغ میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ کہیں کان تو بہرے نہیں۔ اختر میاں تم کیا جانو۔ شادی کے مزے میں ان حنائی اُنگلیوں کو خراب نہیں ہونے دوں گا۔

کہتی ہے میرا خیال کرو۔ کیا کہا۔ کون ارے وہی۔ میری بیوی کی ساس کہتی ہے میں نے تمہیں جایا۔ پالا پوسا۔ بڑھاپا مجھ پر احسان جتاتی ہے۔ شرم نہیں آتی۔ اختر میاں میں نے کبھی احسان جتایا۔ میں جس پر احسان کرتا ہوں ..... جو احسان کر کے جتانے لگے ...... تمہیں دو سال سے پڑھا رہا ہوں۔ تم ہی بتاؤ۔ کبھی تمہیں کچھ کہا۔ کہو بولو۔ کہتے کیوں نہیں۔ چپ کیوں ہو گئے۔ زبان کیوں گنگ ہو گئی۔ بولتے کیوں نہیں۔

⁂

ارے کون بھونک رہا ہے۔ بازاری کُتّے۔ گولی سے اُڑا دو۔ یہ کُتّے آدمی کو کاٹتے ہیں۔ کُتّوں کو کسولی بھیج دو۔ کیا کہا ـــــ اُونچی آواز میں کہو۔ میں ہوں اور تو کوئی نہیں۔ میرے باپ کے متعلق پوچھتے ہو۔ اس کی نظر کمزور ہو گئی ہے۔ وہ عینک مانگتا ہے۔ کتنی عمر ہے اس کی ۶۵ سال بی۔ بی۔ بی ۶۵ سال کا بوڑھا عینک مانگتا ہے۔ کایا کلپ چاہتا ہے۔ بوڑھے نوجوان سے دو قدم بڑھ گئے۔ پھر کہو ـــــ آواز نہیں آتی۔ باز کی آنکھیں لا دوں۔ عقاب کی آنکھیں۔ خوب کہا۔ اختر ـــــ میری بیوی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ عقاب کی آنکھیں عینک چاہتا ہے۔ بینائی چاہتا ہے۔ عینک پر پندرہ روپے قریباً بیر لگے ہوئے ہیں۔ پھر بھی بینائی چاہتا ہے۔ کہاں سے لا دوں۔ ہاں کایا کلپ پنڈت مالویہ ـــــ روپے کہاں ہیں۔ پندرہ روپے نہیں ملتے۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ پندرہ روپوں سے پندرہ فلمیں دیکھ سکتا ہوں پندرہ عورتیں۔ خوبصورت رسیلے ہونٹ نشیلی آنکھیں۔ اُبھرا ہوا سینہ۔ بوڑھا کھوسٹ عینک مانگتا ہے۔

۶۵ سال کے بعد آیا ـــــ آیا ـــــ آیا ـــــ بی۔بی۔بی۔

❖

پھٹ پھٹ پھٹ ۔ دھم ـــــ دھم ـــــ دھم ـــــ کون آیا بم گرا۔ کہاں لندن میں۔ لیکن آواز یہاں آرہی ہے۔ کانوں میں انگلیاں ڈالو۔ خدائی انگلیاں سونے کی قاشیں۔

آزادی۔ لارڈ ایمری کا بیان۔ انڈیا منٹ۔ کیا کہا۔

خوب کہا۔ کون تقریر کر رہا ہے۔ چرچل۔ ہم آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم غلامی کو اس دُنیا سے مٹانا چاہتے ہیں، ہم فرانس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم لڑیں گے۔ ہر جگہ ـــ زمین پر خشکی پر۔ سمندر پر۔ آسمان پر۔ اپنی زمین پر۔ کینیڈا میں۔ آسٹریلیا میں۔ ہم سب کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں ـــــ نہیں میں بھول گیا۔ ہم یورپ کو ہٹلر کے پنجہ سے چھڑانا چاہتے ہیں، کیا یورپ میں ہندوستان بھی شامل ہے.......

خوب زور سے تالیاں پیٹو۔ احتر میاں۔ آزادی مانگتے ہو ـــــ آزادی مانگنے سے نہیں ملتی ـــــ اور کچھ مانگو۔ کیا کہا ـــــ موت ـــــ ابھی لو ـــــ اسی وقت لو ـــــ چلاؤ ـــــ خوب زور سے چلاؤ۔ ہاں کہو۔ مسجد مندر بن گئی۔ مسجد مندر بن گئی۔ وہ دیکھو سامنے۔ بازار بند ہونے لگے سب اپنے گھروں میں گھس گئے۔ لاٹھیاں چلنے لگیں۔ پتھر برسنے لگے۔ ہائے میرا لال۔ کسی ہندو نے گولی سے مار دیا۔ ہائے میرا بچہ ـــــ کسی مسلمان نے چھرا گھونپ دیا ـــــ دیکھا ـــــ دیکھتے نہیں۔ خون کی ندیاں۔ کہاں ـــــ وہ دیکھو ـــــ مندر مسجد بن گیا ـــــ انڈیا فسٹ مت چلاؤ ـــــ آزادی ـــــ ہٹلر کے بعد۔ اور موت ابھی لو ـــــ اسی وقت ـــــ جب جی چاہے ـــــ"

❖

چاندی کے تار

اب جبکہ تمھاری شادی ہو چکی ہے اور تم ایک دوسرے شخص کی آغوش میں جا چکی ہو مجھے تمھیں خط لکھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ گویا ایک عجیب سی بات ہے کہ جب تم خط لکھتی تھیں تو میں جواب دینے سے قاصر تھا۔ اور اب میں تمھیں خط لکھ رہا ہوں لیکن تم اس خط کا جواب دینے سے معذور ہو گی۔ میرے لئے یہ بوجھ بھی ناقابل برداشت ہے کہ میں ایک شادی شدہ عورت کو خط لکھوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس خط کا تمھارے خاوند پر کیا اثر ہو گا۔ اگرچہ میں اس امر کی پوری کوشش کروں گا کہ یہ خط سیدھا تمھارے پاس پہنچے اور تمھارے خاوند کو اس خط کا علم ہی نہ ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خط تمھارے شوہر کو مل جائے۔ یوں ہی ڈاکیہ غلطی کر سکتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کا تصور بھی کر سکتا ہوں۔ کیوں کہ ایک ہندوستانی شوہر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا مرد اس کی بیوی کو خط لکھے۔ اور پھر یہ حقیقت اس پر آشکار ہو کہ اس کی بیوی کسی اور سے محبت کرتی تھی اور اب تک یہ راہ و رسم جاری ہے۔ اس بھید کا کسی ہندوستانی خاوند پر کھلنا، کوئٹہ کے بھونچال کے مترادف ہو گا۔ وہ اپنے شباب کی غلطیوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ آخر ہر شخص شادی سے پہلے محبت کرنا چاہتا ہے، اور کرتا ہے، اگر اسے موقع مل جائے لیکن یہ حق شاید عورت کو حاصل نہیں۔ وہ تو محض ایک جانور تصور کی جاتی ہے جو ماں باپ کی کڑی نگاہوں میں مقید رہتی ہے۔ ایسی عورتوں کے لئے شوہر ایک مقدس چیز ہے۔ اجنتا کی تصویر کی طرح محض ایک دیوی جس پر جذبات کا اثر نہیں ہو سکتا۔ جس

پر ماحول کبھی حاوی نہیں ہو سکتا۔ جس پر زمانے کے نشیب و فراز کا کوئی اثر نہیں۔ آج کل کی لڑکیاں اس امر کی گواہ ہیں کہ زمانے کی بدلتی ہوئی روِنے، حالات اور ماحول نے اُن پر کیا اثر کیا ہے۔ اور اگر ان باتوں کو لوگ سمجھ جائیں تو شاید دُنیا میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد آدھی رہ جائے۔ خاوند عورتوں کو پیٹنا چھوڑ دیں اور ہر گھریلو جھگڑے کے بعد طلاق کی دھمکی نہ دیا کریں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اگر یہ خط تمھارے خاوند کو مل جائے اور تمھیں وہ لعنت ملامت کرے یا پیٹے تو ان باتوں کو نظر انداز کر دینا۔ اور ان نیکیوں کو ماضی کے خوش گوار لمحوں کی خاطر سہہ لینا۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی توقع کرنا محض بے وقوفی ہے کیوں کہ تم مجھے گالیاں دوگی۔ لعنت بھیجو گی اور کہو گی کہ کیوں بیٹھے بٹھائے ایک فتنہ اُٹھا دیا لیکن میں اس فتنے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا ہوں، گو تمھارے لئے یہ فتنہ اسی دن ختم ہو گیا جس دن تمھاری شادی ہوئی۔ لیکن میں ابھی تک کنوارا ہوں۔ اور یہ فتنہ سو سو کر جاگ اُٹھتا ہے۔ اور مجھے بار بار پریشان کرتا ہے۔ یہ پریشانیاں میری نشو و نما کے لئے اچھی نہیں۔ یہ کسک جو دل میں بار بار اٹھتی ہے اسے ایک بار کیوں نہ نیست و نابود کر دوں۔ تمھاری محبت کا قصہ میرے لئے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ ایک سائنس داں کے لئے جراثیم کی ایک نئی سلائیڈ، جو اس نے ابھی ابھی تیار کی اور خورد بین کے نیچے رکھ کر اسے نہایت انہماک سے دیکھ رہا ہو۔ گو تمھاری محبت کا قصہ پُرانا ہو گیا اور اس پر شادی کا رنگ چڑھ گیا۔ لیکن میرے پاس چند ایسی چیزیں ہیں جو مجھے بار بار تمھاری یاد دلاتی ہیں۔ تمھاری چند مسکراہٹیں۔ تمھارے خط۔ تمھارا ریشمی رومال جو تم نے دیوالی کے روز اپنی ننھی بنّو کے ہاتھ بطور تحفہ بھیجا تھا۔ گو تمھاری مسکراہٹوں کی جگہ اب نئی مسکراہٹیں آچکی ہیں اُن کی جگہ اب اور دلفریب ہونٹوں نے لے لی ہے اور ان کا اثر میرے کمزور اعصاب پر زیادہ پڑتا ہے لیکن ان مُسکراہٹوں میں بناوٹ ہے اور ان میں وہ شے لطیف نہیں جو تمھارے تبسّم میں تھی۔ تمھارا تبسّم بالکل البیلا۔ انوکھا اور نرالا تھا۔ شاید تم نے پہلی بار مُسکرانا سیکھا تھا۔ اس مُسکراہٹ میں ایک نیا پن تھا۔ جس میں آنے والے شباب کی صبح تھی۔ ایک انجان معصوم مسکراہٹ بناوٹ سے کوسوں دور ایک بھیگی ہوئی صبح کی طرح شگفتہ تر و تازہ، شبنم کی طرح ٹھنڈی اور چمکدار شعلہ کی طرح سُرخ اور آگ

لانے والی ـــــ و ـــــ ر ـــــ لیکن میں اب ان مُسکراہٹوں کو بھول چکا ہوں۔ اب صرف ان کا تجزیہ کر سکتا ہوں۔ بالکل ایک ڈاکٹر کی طرح جو ایک مرض کو دوسرے مرض سے تشخیص کر لیتا ہے۔ اب بھی کبھی نہ کوئی میری طرف دیکھ کر مُسکرا لیتا ہے اور یہ مُسکراہٹ بجلی کے کوندے کی طرح مجھ پر حملہ کرتی ہے۔ حملہ نہایت شدید ہوتا ہے۔ سراپا ایک جھرجھری سی آجاتی ہے۔ لیکن دوسرے لمحے میں میں سنبھل جاتا ہوتا ہوں اور اس مسکراہٹ کا تجزیہ کرنے لگتا ہوں۔

ہم ایک مشینی دور سے گذر رہے ہیں، ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب پانی اور ہوا پر انسان نے قابو پا لیا ہے۔ ہم وقت، رفتار اور فاصلے پر حاوی ہو چکے ہیں۔ اب روحانی باتوں کا زمانہ نہیں۔ بالکل مادّی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس لئے مُسکراہٹیں بھی مادی ہو گئی ہیں۔ اور جب کوئی میری طرف مسکرا کر دیکھتا ہے۔ سوچنے لگتا ہوں کہ اس مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے۔ اگر میں بھی مُسکرا دوں تو مجھے کیا فائدہ پہنچے گا۔ اور اگر نہ مُسکراؤں تو کیا نقصان ہوگا۔ آج کل ہر چیز نفع اور نقصان کے معیار پر پرکھی جاتی ہے۔ لیکن تمہاری مُسکراہٹوں میں وہ بات نہ تھی، اگر ہوتی تو آج مجھے یوں نہ یاد آتیں تم اسی بات کو لو کہ صرف ایک مسکراہٹ پر کتنا جھگڑا اچل رہا ہے۔ آج کل تو بال کی کھال اُتاری جاتی ہے۔ ہر چیز کا نفسیاتی پس منظر تلاش کرنا پڑتا ہے اور اس کا اثر اعصاب پر دیکھنا پڑتا ہے۔ اور پھر تجزیہ۔ اب یہ محبت نہیں ہے، محض سردردی ہے، ایک بہانہ ہے اپنے آپ کو ختم کرنے کا، لیکن کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید یہ اقدار پرانی اقدار سے اچھی ہیں، ہو سکتا ہے، اگر ہم ان اقدار کو اپنے آپ پر حاوی ہونے دیں، آہستہ آہستہ عمل پذیر ہونے دیں، تو شاید زمانہ بدل جائے اور ہم ایک نئی دنیا بسا لیں۔ لیکن مجھے اس قسم کے روحانی فلسفے سے کوئی سروکار نہیں۔ اور نہ ہی مجھے آج ان "SMS" پر بحث کرنی ہے کہ فلاں چیز اچھی ہے یا بُری ہے۔ میری مرکز نگاہ تو آج تم ہو۔ اور تمہیں بھول کر آج خشک بے جان فلسفوں پر بحث کرنا بے وقوفی ہے شاید مجھے کچھ دن اور زندہ رہنا ہے کیوں کہ ایک جوتشی نے چند دن گزرے مجھے بتایا کہ میں جلد مر جاؤں گا۔ میں جوتشی کے چہرے کی طرف برسوں سے جھوٹ بولنے سے اس کے خدوخال مسخ ہو گئے تھے، چہرے پر ایک قسم کی نحوست برس رہی

تھی۔ اور اس پتھریلی سڑک پر بیٹھے ہوئے نہ جانے اسے کتنے برس ہو گئے تھے۔ اور کون جانتا ہے کہ اس نے کتنوں کے ہات دیکھے۔ اور ان کی قسمت کا جائزہ لیا۔ کتنوں کو اس نے اس ناامیدی کو سر کرنے کی ترکیبیں بتائیں لیکن سڑک پر گذرنے والے نے کبھی یہ سوچا، کہ وہ کیوں بیس سال سے اس خاک آلود سڑک پر بیٹھا ہوا ہے۔ جہاں گندگی اور غلاظت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور پیشاب کی بو سے پھیپھڑے جھلس جاتے ہیں۔ کیا ان بیس سالوں میں اس کی قسمت کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوا۔ کیا وہ ترکیبیں تجویزیں جو وہ دوسروں کو بتاتا تھا۔ کبھی اس نے اپنے اُوپر نہیں آزمائیں۔ کیوں یہ پتھریلی زمین اس کی بنجر زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی۔ کیا یہ سڑک یوں ہی پتھریلی رہے گی۔ اور اس پر چلنے والوں کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوگا۔ میں نے چاہا کہ اس جوتشی کو کھری کھری سُناؤں اور اسے کہہ دوں کہ وہ کیوں جھوٹ بول کر اپنی روح کو گزند پہنچاتا رہا ہے۔ لیکن زندگی میں صرف روح ہی ہوتی تو میں اس سے یہ بات پُوچھ لیتا۔ لیکن زندگی میں روح کے علاوہ پیٹ بھی ہے۔ جو روح سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ روحانی تسلّی کو خیرباد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پیٹ کی بھوک کو خیرباد کہنا مشکل ہے۔

مگر تمھیں ان جوتشیوں اور راہ گیروں سے کیا فائدہ یہ لوگ تو ان انسانوں کے لئے وقف ہیں جنھیں اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ تمھیں تو اس زندگی سے بہت سے کام لینے ہیں۔ اور ایک کام یہ بھی کرنا ہے کہ تمھیں میرا یہ بے سروپا خط بھی پڑھنا ہے۔ یہ ایک احمقانہ بات ہے کہ قہقہہ تو محبت کا شروع ہوا اور میں پیٹ کا قصہ لے بیٹھا۔ دراصل یہ دونوں چیزیں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ان دونوں پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ اگر انسانی زندگی کا دارومدار نہیں تو کم از کم میری زندگی کا انحصار ان ہی دو چیزوں پر ہے۔ اگر میں تمھیں اپنا نہ بنا سکا تو اس میں تمھاری محبت کا قصور نہیں۔ بلکہ ان حالات کا جن پر میں قابو نہ پا سکا۔ اور اگر حالات پر قابو پالیتا تو آج شاید تم میری آغوش میں ہوتیں۔ اور مجھے یہ خط لکھنے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑتی۔

میں نے تمھیں پہلی بار اس وقت دیکھا۔ جب تم پانچویں جماعت میں پڑھتی تھیں۔ یوں ہی تم ایک دن میرے کمرے میں آگئیں۔ یوں ہی نہیں بلکہ تمھیں ایک کام تھا۔ اس وقت گو تمہارا قد چھوٹا تھا۔ پتلا سا جسم اور خد و خال نہایت تیکھے۔ تمھارے خد و خال نے مجھے بالکل نہیں اکسایا۔ بلکہ اس بے باکی، اس بے تکلفی نے جو تم نے میرے ساتھ برتی۔ تم نے بغیر کسی جھجھک کے کہہ دیا۔ کہ بہن جی انگلش ریڈر مانگتی ہیں۔ میں تمھاری صورت کا جائزہ لے رہا تھا۔ تم نے خود ہی الماری کھولی اور کتاب تلاش کرنے لگیں۔ میں تمھاری بے باکی پر اور بھی حیران ہوا۔ تمھارے سر سے دوپٹہ سرک گیا تھا اور تمھارے سیاہ بال میری نظروں میں الجھنے لگے۔ اس دن مجھے تمھارے بال اچھے لگے تھے۔ کتنے سیاہ اور لمبے تھے۔ تم نے جلدی ہی کتاب ڈھونڈ لی۔ اور پھر چلی گئیں۔ یہ تھی پہلی ملاقات۔ کتنی بے جان بے لذت اور فروعی۔ جس کا ذکر کرنا نہایت فضول معلوم ہوتا ہے۔ صرف ایک لفظ میں اس ملاقات کے اثر کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ تم اس دن نہایت بے باک تھیں۔ اور تمھارے بال سیاہ اور لمبے تھے۔ اور دو سال کے بعد جب تم مجھے ملیں تو میں تمھیں پہچان نہ سکا۔ ان دو سال میں تم کیا سے کیا ہو گئی تھیں۔ اس دن مجھے تمھارے بال اچھے لگے تھے۔ آج تمھارا قد بینچ کی طرح لانبا اور نازک اندام میں نے سرو سے اس لیے تشبیہ نہیں دی کہ یہ تشبیہ پرانی ہو چکی اور زیادہ استعمال سے اس لفظ کی خوبصورتی مٹ چکی ہے۔ بینچ کا درخت تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔ کیوں کہ شہروں میں بینچ کے درخت نہیں ہوتے۔ سرو بہت ہوتے ہیں اور میں تمھارے تصور کو بہت دور لے جانا چاہتا ہوں تا کہ شادی کے ماحول سے نکل کر تم چند ساعتوں کے لیے اس دنیا میں آجاؤ جہاں میں سانس لے رہا ہوں تا کہ تم بھی ماضی کے واقعات سے میری طرح لطف اندوز ہو سکو۔ تم اگر اکیلی ہوتیں تو میں تمھیں زیادہ انہماک سے دیکھتا۔ اور ایک نقاش کی حیثیت سے تمھارے خد و خال کا جائزہ لیتا۔ لیکن تمھارے ساتھ ایک اور بھی لڑکی تھی جس کا حسن صبیح تمھاری موہنی صورت پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس کا کھلا ہوا چہرہ غلافی آنکھیں۔ اور رس بھرے ہونٹ تمھارے طبوتر سے

چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور پتلے پتلے ہونٹوں کے مقابلے میں زیادہ اچھے لگے ۔ تم اس دن شرم وحیا سے سمٹی ہوئی تھیں اور وہ زیادہ بے باک نظر آرہی تھیں۔ اسے اپنے جسمانی حسن کا احساس تھا اسی لئے وہ اٹھلا اٹھلا کر چلتی تھی ۔

اور اس کا ابھرا ہوا سینہ مجھے زیادہ پسند آیا ۔ جس میں شباب کی ساری تازگی پنہاں تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوانی ایک سیلِ آتشیں کی صورت میں ان بلندیوں کے پیچھے کروٹیں لے رہی ہے ۔ اور یکایک اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اس مشینی دور میں بھی عورت کا شباب زندہ ہے ۔ ازل سے لے کر ابد تک اس شباب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ انسانوں کی حرکات، سکنات ، ان کا نصبُ العین اُن کی معاشرت ان کی اخلاقی سیاسی قدریں بدلتی رہی ہیں ۔ لیکن عورت کا شباب اسی شدت سے محسوس کیا جاتا ہے ۔ صدیوں کا آہنی چکر شباب کی رعنائیوں لطافتوں اور کیفیتوں کو نہیں کُچل سکا۔ اب بھی بیسویں صدی میں ایک مرد ایک عورت کے لئے پاگل ہو سکتا ہے ایک عورت کے لئے تخت و تاج چھوڑ سکتا ہے ۔

لیکن تمھاری سہیلی کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ اس کا حسن اتنے تباہ کُن نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایسے چلتی تھی گویا اسے لوگوں کی کوئی خاص پروا نہ تھی ۔ اگر لوگوں کی نظریں اس کے سینے پر پڑتی تھیں تو پڑتی رہیں ۔ اور اگر اس کا گرنا ضرورت سے زیادہ اُبھرا ہوا ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں اور تم ـــــ تمھارا قد لمبا تھا۔ جسم پتلا سا تر ناری کی بیل کی طرح لچکتا ہوا۔ اور پھر تم کچھ حد سے زیادہ شرمیلی ہو گئی تھیں ۔ تمھارے چلنے کا انداز نہایت ہی بھدا تھا۔ گردن نیچے کر کے کبھی کبھی مُڑ کر دیکھنا۔ کبھی چھپ کر کنکھیوں سے ۔ کبھی لبوں پر مسکراہٹ ہے تو کبھی لب جامد ہیں ۔ کبھی تمھارا سر ملتا تھا تو کبھی ہات اور اپنی سہیلی کے ساتھ کھسر پُسر کرنا اور اس کے ساتھ لپٹ لپٹ کے چلنا ـــ مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا ۔ اور جب تم گلی کے موڑ پر پہنچیں تو تم نے مجھے ہاتھ سے نمستے کی ۔ مجھے امید تھی کہ تم اس طرح کرو گی ۔ تم ایسی لڑکیاں نہایت ہی جذباتی ہوتی ہیں تم پوچھ سکتی ہو کہ مجھے کیوں کر معلوم ہوا کہ تم ایسا ہی کرو گی ۔ محض تجربے کی بنا پر مجھے معلوم ہے ۔ جو لڑکی زیادہ شرمیلی اور خاموش

ہوتی ہے وہ اکثر تصور کی دُنیا میں ڈوبی رہتی ہے ۔ اسے خود نمائی کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے خیالات زیادہ حسین اور رنگین ہوتے ہیں۔ لیکن جو لڑکی زیادہ ہنستی ہے۔ جیسے اپنے حسن کا ضرورت سے زیادہ احساس ہوتا ہے وہ جذباتی کم اور کاروباری زیادہ ہوتی ہے ۔ ایسی لڑکیاں اشارے کم کیا کرتی ہیں، خط کم لکھتی ہیں۔ شاید وہ سمجھ جاتی ہیں کہ آخر انھیں ایک دن شادی کرنا ہے تو پھر ان جھنجھٹوں سے کیا حاصل ۔ ان اشاروں اور خطوں سے کیا ملے گا ۔ چھپ چھپ کر ملنا، مُڑمُڑ کر دیکھنا ۔ نگاہوں سے مُسکرانا ۔ ایسی باتیں انھیں فضول لگتی ہیں ۔ وہ جی بھر کے ہنس لیتی ہیں۔ وہ مردوں سے کم ڈرتی ہیں اور شرم ڈر اور جھجھک کے غلاف کی پناہ نہیں لیتیں ۔ ان کی جنس کا اظہار ان کی خود نمائی میں ہوتا ہے اور شاید یہ طریقہ دوسرے طریقوں سے بہتر ہے ۔ لو ــــــ میں پھر نفسیاتی چکر میں اُلجھ گیا ۔ مجھے اس سے کیا کہ فلاں عورت جذباتی ہے فلاں نمائش پرست ہے یا فلاں عورت ایسی ہو سکتی ہے یا ہو جائے گی ۔ ان باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ۔ تو ہاں اس ملاقات کے بعد تمھاری عادات بدل گئیں ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے تم نے اپنے آپ کو اور زیادہ سیکڑ لیا ہے ۔ بالکل لاجونتی کی بیل کے پتوں کی طرح جو ذرا سے لمس سے سکڑ جاتے ہیں ۔ اگرچہ تمھارا قد لمبا ہوتا جارہا تھا اور تمھاری آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو رہی تھی لیکن تم ضرورت سے زیادہ گھٹی گھٹی نظر آنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ تمھارے ذہن پہ ایک بوجھ سا ہے جس کا احساس تمھیں نہایت شدت سے ہو رہا ہے ۔ مجھے کیا معلوم کہ گھر والوں سے تمھارا کیا رویہ تھا ۔ شاید تم گھر میں ہنستی ہوگی ۔ کھُل کر باتیں کرتی ہوگی لیکن میں کامل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ملاقات کے بعد جب بھی تم گلی میں ملیں تو تم مجھے دیکھ کر گھبرا گئیں اور پھر مجھے دیکھ کر بھاگ گئیں اور ایک دن میں نے تمھارا تعاقب بھی کیا کہ معلوم کروں کہ تم مجھے دیکھ کر کیوں بھاگتی ہو ۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا ۔ تم نے دو تین بار اس طرح کیا اور میں بہت سٹ پٹایا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے ۔ تمھاری یہ حرکتیں کیا معنی رکھتی ہیں ۔ ان چند مہینوں میں کیا کچھ ہو گیا کہ تم مجھے دیکھ کر ٹھٹھک جاتیں یا پھر جلدی سے بھاگ جاتی ہو اور پھر ایک دن عقدہ کھُلا ۔ جب ماں نے مجھ سے کہا کہ بڑے چودھری کے گھر سے سگائی کے لئے

کہہ رہے ہیں۔ "تمھاری کیا رائے ہے" پھر میں سمجھ گیا کہ تم کیوں جھینپ جاتی ہو اور مجھے دیکھ کر گھبرا جاتی ہو اور میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہو۔ تمھارے حُسنِ تخیّل کی میں داد دیتا ہوں کہ منٹوں ہی منٹوں میں تم مجھے کہاں سے کہاں لے گئیں۔ اماں نے پھر پوچھا کہ "تمھاری کیا رائے ہے" ان کا مطلب تھا کہ میں ہاں کرلوں میں ان دنوں بی اے فیل ہو چکا تھا اور اپنے چچا کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا۔ میرے چچا شہر کے مشہور ڈاکٹر تھے اور ان کی یہ رائے تھی کہ میں بھی اس دوکان پر کام کروں اور اسی طرح ڈاکٹری سیکھ لوں، اور پھر اس شہر میں ڈاکٹری کی دوکان کھول لوں۔ تجویز کتنی معقول تھی۔ لیکن مجھے بالکل ناپسند تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے عطائیوں سے نفرت ہے۔ گو میں یہ بات جانتا ہوں کہ اگر میں ڈاکٹری سیکھ لیتا تو اس وقت تک کافی روپے کمائے ہوتے۔ ڈاکٹر گردھاری لال اور ڈاکٹر تارا سنگھ دونوں نے میرے سامنے ہی پریکٹس شروع کی۔ دونوں نے ڈاکٹری کا امتحان کہیں سے پاس نہ کیا تھا لیکن جاہل لوگوں کو جاہل تر بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ چند دوائیں ایک چھاتی دیکھنے کا آلہ اور تھرمامیٹر خرید کر انسان ایک مکمل ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ مریضوں کو جہنّم میں بھیجے یا جنّت میں۔ لیکن مجھے یہ طریقے پسند نہیں۔ میں ہر چیز کو مکمل طور پر دیکھنا چاہتا ہوں اس لئے میں نے ڈاکٹر بننے کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن تمھارے والد کا اصرار بڑھتا گیا۔ اور وہ سگائی پر زور دینے لگے۔ تمھارے پیغام بھی مجھے ملتے رہتے تھے اور جو کچھ تم نے اپنے رشتہ دار ہریش سے کہلوادیا۔ وہ مجھے یاد ہے' ان سے کہو کہ وہ سگائی کرلیں۔ میں اس بے باکی کی داد دیتا ہوں کہ تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے منتخب کرلیا اور تم نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ سگائی ہو جائے اور آخر یہ باتیں شہر میں پھیل گئیں اور شہریوں کی زبان پر چرچا ہونے لگا۔ اس چھوٹے شہر میں تمھارے والد کا کافی رسوخ تھا۔ اس لئے اس بات نے کافی اہمیت اختیار کرلی اور اکثر دوستوں نے مجھ سے کہا۔ بھئی سُنا ہے تمھاری سگائی ہو گئی ہے۔ بھئی خوب ہے اچھی نبھے گی۔ میرے دوستوں نے تمھیں اکثر دیکھا ہوگا اور تمھارے حُسن کی بے باکیوں نے انھیں پریشان بھی کیا ہوگا۔ ان کے تعریفی فقرے جو وہ ہم دونوں پر کستے تھے۔ ان میں ان کی جنسی بھوک کا وحشیانہ اظہار تھا۔ اب تم نے ہمارے گھر آنا بند کر دیا۔ کیوں کہ ماں نے ہاں کر دی تھی اور

تمھیں اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب تمھاری شادی اس گھر میں ہو گی۔ تمھارے پیغام میرے پاس پہنچتے تھے۔ گھر کا دروازہ ذرا اونچا کرا لو۔ میں روز بروز لمبی ہوتی جا رہی ہوں۔" پرسوں آپ نہایت ہی گندے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔" "کیا شہر میں نائی کوئی نہیں۔" "آپ نے میری طرف دیکھا نہیں اور میرے قریب سے گزر گئے۔" "میں اکثر چھ بجے شام کو گلی والے درخت کے قریب کھڑی ہوتی ہوں اور اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی ہوں۔ تم بھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے گزرا کرو۔ اور اسی طرح کئی اور احکام جو میں کبھی نہ بجالا سکا۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مجھے کچھ اس قسم کے عشق سے نفرت ہو گئی ہے گو میں سمجھتا ہوں کہ تمھارے لئے یہ بات نئی تھی بالکل نئی کیوں کہ تمھارے جسم کی تشکیل یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ جوش بالکل نیا ہے۔ یہ اُبال شاید پہلا اُبال ہے اس کی اُٹھان ہی نرالی ہوتی ہے اور انسان اس حالت میں اتنا بے قابو ہو جاتا ہے کہ اسے اونچ نیچ کی پرواہ نہیں رہتی۔ اگر میری بھی اوّلین محبت ہوتی تو شاید میں بھی یہی کرتا اور ہم دونوں نہ جانے کیا کر بیٹھتے۔ لیکن میں اس سے پہلے ایک عورت سے محبت کر چکا تھا اور وہ بھی ایک شادی شدہ عورت سے۔ اگرچہ یہ پڑھ کر ہنسو گی کہ ایک مجرد انسان ایک شادی شدہ عورت سے کیوں کر محبت کر سکتا ہے۔ تمھاری طرح میرے دوست بھی مجھ پر ہنستے ہیں۔ ہندوستان میں محبت کی قدریں ابھی پرانی ہیں۔ یہاں ایک شادی شدہ عورت کی طرف دیکھنا ایک فعلِ بد سمجھا جاتا ہے۔ سماج کہتا ہے۔ وہ عورت تو دوسرے کی ہو چکی، اب تمھارا اس پر کیا حق ہے۔ اب تم اس کی طرف کیوں دیکھتے ہو۔ شادی شدہ عورت کی شخصیت تو ایک شخص کی ملکیت ہو چکی۔ اب تم کیوں جھک مارنے پر تلے ہوئے ہو۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے اس عورت سے محبت تھی اور اس کے بعد آج تک کسی اور سے محبت نہ کر سکا۔ اگر تم اس عورت کو دیکھتیں تو اس عورت کو دیکھ کر منہ پھیر لیتیں۔ وہ خوبصورت نہ تھی۔ لیکن میں نے اس سے جی بھر کر محبت کر لی یہ میرے شباب کا اوّلین عکس تھا۔ جس شدت سے میں نے اس عورت کو چاہا۔ وہ گرمی وہ تڑپ وہ اضطراب میرے جسم میری روح میں پھر کبھی نہ آ سکا۔ یہ ایک لمبی سرگزشت ہے۔ جس کا انجام نہایت بھیانک ہے اس عورت کے لئے میں بہت بدنام ہوا اور اسے بھی میرے لئے کافی ذلت اٹھانی پڑی۔ پانچ

سال ہوئے وہ مرگئی۔ لیکن اس کی یاد ابھی تک زندہ ہے، اس کی محبت کی تپش باقی ہے جس سے میں اکثر بے چین ہو جاتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جس طرح تم اپنے آپ کو میرے لئے پریشان کرتی رہی ہو اس طرح میں اپنے آپ کو اس عورت کو پانے کے لئے پریشان کرتا رہا۔ میں تو خیر بامراد رہا۔ مگر تم میرے ہاتھوں کے لمس سے بیگانہ رہیں۔ لیکن محبت اور شادی میں فرق ہے۔ میں اس عورت سے محبت کر سکتا تھا شادی نہیں۔ اور تمھارے ساتھ شادی کر سکتا تھا محبت نہیں۔ میں نے کوشش کی میں تم سے محبت کر سکوں لیکن ایسا نہ کرسکا۔ اکثر تمھارے خدوخال میری آنکھوں کے سامنے آجاتے اور میں نہایت باریکی سے ان کا تجزیہ کرسکتا اور ان میں طرح طرح کے نقص نکالتا۔ اور یہ سوچتا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر تمھاری آنکھیں بڑی بڑی ہوتیں اور تمھاری ٹھوڑی ضرورت سے زیادہ لمبی نہ ہوتی اور اگر تمھارا نچلا ہونٹ ذرا موٹا ہوتا تو زیادہ خوبصورت ہوتا۔ اور اگر تمھاری آنکھوں کی پلکیں زیادہ گھنی ہوتیں تو تمھاری آنکھوں کی چمک زیادہ نمایاں ہو جاتی اور پھر تم نہایت بے ڈھنگے پن سے لمبی ہوتی جا رہی تھیں کولہوں اور کمر میں کوئی تناسب نہ تھا۔ اگر کمر پتلی تھی تو کولہے متناسب نہ تھے۔ اور باقی جسم پر بھی اتنا گوشت نہ تھا کہ تمھارے اعضا زیادہ متناسب ہو جاتے۔ اس قسم کے گھناونے خیال جو شرافت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ مجھے ستایا کرتے۔ اس عمل کو روکنا میرے بس میں نہ تھا۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود تم میں جاذبیت تھی۔ اتنی جاذبیت کہ میں تم سے شادی کر سکتا تھا۔ لیکن محبت نہیں۔ محبت کے لئے کچھ اور چاہئے۔ ایک خاص قسم کا حُسن — ایک قسم کا — کیا کہوں —!

تم تو مجھے پسند تھیں۔ صرف پسند۔ میں تمھیں پسند کر سکتا تھا۔ اور تمھیں پسند کر سکتا ہوں۔ اور شادی بھی کر لیتا۔ اگر حالات اجازت دیتے۔ ہاں حالات — شاید تم ہنس دو۔ اور کہو کہ ہندوستان میں ہر انسان شادی کر لیتا ہے خواہ اس کے حالات اچھے ہوں یا بُرے۔ شادی تو ان کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ موت۔ لیکن زندگی میں موت گوارا نہیں کی جاتی۔ میرے تمام دوستوں نے شادیاں کر لی ہیں۔ گو اُن کے اقتصادی حالات مجھ سے بہتر نہ تھے تو کیا میں شادی نہ کرسکتا تھا۔ اب تو میں نے بی۔ اے بھی کر لیا تھا۔ اور اگر چاہتا تو کسی بنک یا گورنمنٹ کے کسی محکمے میں نوکر ہو جاتا۔ اور تمھارے دل کی آرزوؤں کو پورا کر دیتا۔ لیکن میں ان چیزوں سے بہت گھبراتا ہوں، تمھارے والد نے مجھے سگرٹوں کی ایجنسی لینے

کے لئے کہا تھا۔ کہنے لگے کہ سگریٹوں کی ایجنسی میں بہت فائدہ ہے گورنمنٹ کی نوکری میں کیا دھرا ہے۔ یہ ایجنسی لے لو۔ اور کام کرتے جاؤ۔ ساری دنیا سگریٹ پیتی ہے اور خاص کر اس شہر کے لوگ تو سگریٹ اور نسوار کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر ایجنسی کے ساتھ نسوار کا بھی ٹھیکہ لے لو تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ چند ہی برس میں میری طرح ایک عالیشان مکان بنوا لو گے۔ اور لڑکوں اور بچوں کے درمیان ایک با عزت انسان بن جاؤ گے۔ سگریٹ کی ایجنسی اور ـــــ نسوار ـــــ نسوار سے مجھے نفرت ہے۔ لیکن میں سگریٹ پیتا ہوں اور جب کبھی حد سے زیادہ مغموم ہو جاتا ہوں تو کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتا رہتا ہوں۔ فضا میں دھواں پھیلتا رہتا ہے۔ بکھرتا رہتا ہے اور میرے پریشان آوارہ خیالات دھوئیں کی سفید سفید لہروں میں تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ اس طرح مجھے تسکین ہو جاتی ہے۔ یوں ہی چھوٹی سی فروعی باتوں سے تسکین ہو جاتی ہے۔ نہ جانے کیوں۔ لیکن ایجنسی لینے سے تو رہا ـــــ نسوار ـــــ توبہ توبہ ـــــ مکان بنانے کی خواہش نہیں اور با عزت انسان بننا میں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ ان دنوں میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور کیا کروں گا۔ ایک بے کیف سی آوارگی۔ میرے دل و دماغ میں بسی رہتی، کوئی چیز پسند نہ آتی تھی۔ دوکان پر کام کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ آخر میں کیا چاہتا ہوں اس کے متعلق میں سوچتا رہتا۔ کاش میں کہیں کلرک ہی بھرتی ہو گیا ہوتا اور ساٹھ روپے ماہوار لے کر تم سے شادی کر لی ہوتی۔ اور ان چھ سالوں میں کم از کم چھ بچے پیدا کئے ہوتے۔ شاید مجھے تسکین ہوتی اور لوگوں سے کہہ سکتا کہ میں نے بھی دنیا میں کچھ کام کیا ہے۔ آخر میں اپنے دوستوں کے نقش قدم پر کیوں نہ چلوں۔ اگر انھیں حق حاصل ہے کہ وہ ہر سال ہندوستان کی آبادی میں ایک فرد کا بغیر سوچے سمجھے اضافہ کر دیں تو میں کیوں دریا کے کنارے کھڑا رہوں۔ کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لوں۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ اور میں اکثر سوچتا رہتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کیوں پریشان ہوں اور آہستہ آہستہ مجھ پر یہ بات آشکار ہونے لگی کہ مجھے کلرکی سے نفرت ہے۔ مجھے ان ساٹھ روپوں سے نفرت ہے۔ مجھے ان بچوں سے نفرت ہے۔ مجھے انسانوں کی کمینگی سے نفرت ہے۔ یہ کیوں ہر طرف غلاظت ہی غلاظت نظر آتی ہے۔ کیوں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا،

بے چھتوں پر اندھیرا، تنوں پر اندھیرا، چولھے پر اندھیرا۔ روٹیوں پر اندھیرا اور آہستہ آہستہ یہ اندھیرا بڑھتا جاتا ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے پر چھا جاتا ہے۔ انسان کے ریشے ریشے میں سما ئے جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے اس نظام سے نفرت ہونے لگی۔ جہاں اس قسم کا اندھیرا پھیلا رہتا ہے۔ کیوں نہ میں اس اندھیرے کو چیر دوں۔ اس اندھیرے کی قبا کو پھاڑ دوں۔ تاکہ روشنی کا منبعِ اعظم پھوٹ پڑے کم از کم ان چھوٹے مکانوں میں روشنی تو آجائے۔ ان چھوٹے کمروں میں جہاں ایک جگہ میاں بیوی اور بچے ہوتے ہیں چمک آجائے۔ جہاں مہینے میں ساٹھ روپے ملتے ہیں۔ اور کھانے والے افراد آٹھ ہوتے ہیں۔ جہاں شادی کے بعد عورتیں جلد بوڑھی ہوجاتی ہیں۔ جہاں ان کی آنکھوں کی چمک بہت جلد غائب ہوجاتی ہے اور ان کی ملائم مخروطی انگلیاں برتن صاف کرتے کرتے ٹیڑھی ٹیڑھی ہوجاتی ہیں۔ جہاں ان کے چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آتی ہیں اور ہڈیوں پر چمڑا اتنا سخت اور کھردرا ہوجاتا ہے کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں ان کے گالوں کے گڈھے اتنے گہرے ہوجاتے ہیں کہ ان میں جنسی بھوک کسی ہوئی چمگادڑوں کی طرح کراہتی ہے۔ وہ سیاہ بال جن پر ان کا خاوند جان چھڑکتا تھا۔ آج بوٹ پالش کے بُرش کی طرح خُشک اور کھُردرے ہوگئے ہیں۔ آنکھوں کی تابانی کہاں گئی۔ وہ میٹھی شہد جیسی آواز کہاں غائب ہوگئی۔ اور انسان کیوں گنوار اور حیوان بن جاتے ہیں۔ بے روح۔ صرف چلتی پھرتی ٹانگیں۔ اور ان پر کپڑوں کے خول اور اندر کچھ بھی نہیں ـــــ دکھائی نہ دینے والا انسان۔ اور آہستہ آہستہ یہ حقیقتیں مجھ پر بارِ گراں ہوگئیں۔ دل میں اس نظام کے خلاف ایک جذبہ بھڑکنے لگا لیکن اس دوران میں چند لمحے ایسے بھی آئے کہ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ تمھاری یاد کا جال آہستہ آہستہ مضبوط ہو رہا تھا۔ اور اس شہر میں رہتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ میں تمھیں بھول جاتا یا نظرانداز کردیتا۔ تمھاری باتیں اکثر مجھ تک پہنچتیں۔ تم اکثر مجھے کہیں نہ کہیں مل جاتیں۔ کبھی کبھی اپنے نوکر کے ساتھ۔ کبھی سہیلیوں کے ساتھ۔ اور کبھی اماں کے ساتھ۔ تمھاری آنکھوں کا حزن وملال تمھاری نگاہوں کی ذراسی جنبش مجھے کبھی کبھی پریشان کردیتی۔ اور پھر تمھارے والد نے کچھ عرصے سے مختلف تحائف ہمارے گھر بھیجنا شروع کردیئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سگائی کی بات پکی ہوگئی لیکن

میں جانتا تھا کہ یہ کام ہونے والا نہیں۔ گھر والے اکثر مجھے نوکری کے لئے مجبور کرتے، لیکن میں گھر والوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ نوکری اچھی ملتی نہیں اور اس طرح آنے والے خطرے کو ٹالتا رہا۔ آخر تمھارے والدین نے تنگ آکر مجھ سے پوچھ ہی لیا — کہ میری کیا رائے ہے؟ کب تک شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ "پہلے پہل میں نے سوچا کہ میں انھیں گول مول جواب دے دوں۔ کیوں کہ میں تم سے رشتہ ناطہ توڑنا نہ چاہتا تھا۔ کون چاہتا ہے کہ اس سنہری جال کو توڑ دیا جائے جس میں آرزوؤں تمناؤں اور خواہشوں کا تانا بانا لگا رہتا ہے۔ کم از کم میں تو نہیں چاہتا تھا کہ تم میرا کورا جواب سن کر مجھ سے روٹھ جاؤ۔ اور میں تمھاری مسکراہٹوں سے اتنی جلدی محروم ہو جاؤں، تمھاری نگاہوں کی نوازش سے محظوظ نہ ہو سکوں۔ تمھاری باتیں اکثر مجھ تک پہنچ جاتی تھیں۔ جن سے میرے جذبۂ مردانگی کو کچھ تقویت ملتی تھی۔ لیکن میں یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ تمھارے والدین کو ہمیشہ کے لئے تاریکی میں رکھوں۔ اگر میں شادی کرنا نہیں چاہتا تو کم از کم ہندوستان میں اور نوجوان موجود ہیں۔ جو تمھارے لبوں کو چومنے کے لئے بے قرار ہیں۔ اس لئے میں نے تمھارے والد سے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک میں اپنے لئے کوئی اچھا سا کام تلاش نہ کرلوں؛ شادی نہیں کروں گا۔ تمھارے والد نے کہا۔ شادی کرلو اور شادی کے بعد لڑکی ہمارے گھر رہے گی۔ اور جب تک تم کسی اچھے عہدے پر فائز نہیں ہوتے لڑکی کے اخراجات کے ہم ذمہ دار ہوں گے۔ تجویز کتنی معقول تھی کہ خرچ تو تمھارے والد کریں اور بچے میں پیدا کرتا جاؤں۔ لیکن یہ کب تک ہوسکتا تھا۔ آخر ایک نہ ایک دن مجھے اپنے بچوں کا باعزت باپ بننا پڑے گا۔ میرا ضمیر اس ذلت کو برداشت نہ کرسکا۔ کیوں کہ اس نظام میں ایک اچھی جگہ حاصل کرنا ایک اہم سر کرنا ہے۔ اور چونکہ میں ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں اور طبقاتی کشمکش کی بہیمیت اور شقاوت ہر روز بڑھتی جارہی ہے ہر شخص ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کے لئے تیار ہے اور اگر متوسط طبقے کا کوئی فرد اس خلیج کو پاٹنا چاہے یا یہ کوشش ہی کرے تو اس کے ساتھ ہی اس کی طانگ کھینچتے ہیں اور عرشی طبقے والے لوگ کب یہ گوارا کرتے ہیں کہ کوئی زمینی آدمی ان کے محلوں میں قدم رکھ سکے۔ اور اس کرب انگیز کشمکش میں وہ انسان نہیں رہتا۔ ایک بے روح بے جان

لوتھ بن جاتا ہے اور مجھے تو اس روشنی کے مینار کو پانے کے لئے کافی جدوجہد کرنی تھی۔ میرے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارش نہ تھی۔ رشوت اور تحفوں کے لئے اتنا روپیہ نہ تھا اور انگلینڈ سے کوئی ڈگری بھی لے کر نہ آیا تھا۔ کوئی رشتہ دار کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہ تھا۔ تو ان حالات میں میں کیسے ایک اچھی جگہ حاصل کر سکتا تھا۔ صرف کلرکی اپنا منہ کھول رہی تھی اور وہ بھی ساٹھ روپوں کی کلرکی جو آج کل جنگ کے زمانے میں ٹکے پر بکنے لگی ہے۔ اور پھر ہر پڑھا لکھا نوجوان کلرک بن کر اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا ہے اور بچے پیدا کرنے سے ذرا نہیں جھجکتا۔ اور کبھی کبھی تمھاری سنہری آرزوؤں کا جال میرے قریب آجاتا تو میرے صبر کے بند ٹوٹ جاتے۔ اور میں سوچتا کہ مجھے کیا غرض ہے کہ میں اپنے آپ کو یوں برباد کر دوں۔ ازل سے لیکر ابد تک یہ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اور آج تک کوئی شخص اس اندھیرے کو دور نہ کر سکا بلکہ یہ اندھیرا دن بدن زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ اور میں اس روشنی کے مینار کو پانے کی بے سود کوشش کر رہا ہوں کیوں نہ میں اپنے آپ کو اس اندھیرے کے وسیع اور بے پایاں سمندر میں پھینک دوں اور ہمیشہ کے لئے اس میں غرق ہو جاؤں اور پھر اس اندھیرے میں تمھارے ہونٹ چمکنے لگتے۔ تمھارے گال تمتمانے لگتے۔ تمھارے لانبے لانبے بال سر سے لیکر پاؤں تک چھا جاتے۔ تمھاری آنکھوں میں سنہری آرزوئیں ناچنے لگتیں۔ اور میں تمھیں پکڑنے کی کوشش کرتا تاکہ تمھارے سیاہ بالوں میں اپنے آپ کو چھپا لوں۔ اور تمھاری آتشیں خواہشیں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں۔ اور ہم دونوں اس اندھیرے سمندر میں باقی انسانوں کی طرح لڑھکتے رہیں۔ کم از کم تمھارے ہونٹوں کا لمس مجھے ہمیشہ کے لئے ان اقتصادی جھنجھٹوں سے آزاد کر دے گا۔ لیکن میں نے سگرٹوں کی ایجنسی لے کر شادی کرنا گوارا نہ کیا —— جاہل!

شاید مجھے عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کی کبھی آرزو نہ ہوئی، بلکہ مجھے ان لوگوں سے نفرت سی ہو گئی ہے اور اس طرز بود و ماند سے اس معاشرت سے۔ اس تہذیب و تمدن سے میں روشنی کے مینار کو پانا چاہتا ہوں۔ اور اس کی نورانی کرنوں کو دنیا میں بکھیرنا چاہتا ہوں تاکہ اس پھیلے ہوئے بے پایاں اندھیرے میں کچھ کمی ہو جائے۔ لیکن آج تک روشنی کے مینار کو کون پا سکا ہے۔ یہ سرمایہ دار قوتیں ہمیں اسی روشنی کے مینار کے نزدیک بھٹکنے نہیں دیتیں۔ میں یوں ہی اس بحث میں پڑ گیا۔

جیسے لوگ سرمایہ دارانہ نظام کو نہیں سمجھتے۔ ان باتوں سے کچھ بنتا ہے ناحق میں اپنے دماغ کو پریشان کر رہا ہوں۔ اب تم شوہر والی ہو۔ ایک بچے کی ماں ہو۔ اور تمہارا گھر ہے۔ اور معلوم نہیں تم کیا ہو۔ اور کیا ہو جاؤگی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا شوہر لوہے کا بیوپار کرتا ہے۔ آج کل لوہے کی اشد ضرورت ہے اور لوہے کی قیمت تو سونے کے برابر ہے۔ آج کل تمہاری چاندی ہے۔ کہاں سرمایہ دارانہ نظام کی باتیں اور کہاں لوہا اور سونا۔ دراصل ہماری ذہنیت بھی سرمایہ دارانہ ہوگئی ہے۔ ہم خطوں میں بھی ان چیزوں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ تم جانتی بھی ہو۔ تم نے میرا انتظار کیا۔ ایک سال۔ دو سال۔ تین سال۔ شاید کہیں نوکری مل جائے۔ لیکن میں نوکری کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے نوکری کہاں ملتی۔ آخر تمہارے والدین نے تنگ آکر تمہارے لئے بھر ڈھونڈھنا شروع کر دیا۔ اور میں اس دوران میں تمہارے طعنے سنتا رہا۔ اور آخر تم کب تک میرا انتظار کرتیں۔ ہر مرد ایک آسودہ زندگی گذارنا چاہتا ہے تو پھر تمھیں حق تھا کہ تم اپنے رویّے کو بدل دیتیں۔ اور اپنی زندگی ایک نئے قالب میں ڈھالتیں۔ اور پھر ایک دن تمہاری بارات آگئی۔ میں اس دن اسی شہر میں تھا۔ تمہارے والد نے مجھے مدعو نہ کیا۔ شاید یہ ناراضگی کا اظہار تھا۔ کہ میں نے کیوں شہر کے ایک بڑے آدمی کی بات نہ رکھی۔ اور ناطہ توڑ دیا۔ تم جس طرح مجھے بھول گئیں میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور جس خوشی سے تم نے اپنے خاوند کے گلے میں ہار ڈالا اس کی بھی داد دیتا ہوں۔ تمہاری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ تم بہت خوش تھیں۔ یہ باتیں سن کر مجھ پر صدمہ ہوا لیکن تمہاری اس نئی روش نے مجھے ذہنی تقویت بھی دی۔ زندگی کے ایک نئے زاویئے سے آگاہ کر دیا۔

تم نے میری یاد کو دل و دماغ سے اس طرح خارج کر دیا جس طرح ایک نئی دلہن شادی کے چند مہینوں بعد اپنا لال جوڑا اُتار پھینکتی ہے۔ مجھے معلوم ہے تم ہنستی کھیلتی اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئیں۔ تم مجھے پیر پور کے اڈّے پر ملیں۔ جب تم گونے کے بعد واپس آرہی تھیں تمہارا خاوند تمہارے ساتھ تھا۔ وہ کچھ وجیہہ نہ تھا یہ محسوس کر کے مجھے خوشی ہوئی۔ کم از کم وہ مجھ سے زیادہ خوش شکل نہ تھا بلکہ میں تو نہایت فراخدلی سے اسے بھدا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن تم خوش تھیں

تم نے ایک نہایت قیمتی ساڑی پہن رکھی تھی ۔ جس کا روپہلی کنارہ تمہارے سیاہ بالوں کو چوم رہا تھا۔ تمہارے چہرے کا صرف ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا اس لئے میں تمہاری خوشی اور انبساط کا پورا اندازہ نہ کرسکا۔ تم نے مجھے دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں اور جوار کے لہلہاتے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگیں ۔ اور پھر لاری چل پڑی ۔ تم نے شادی کر کے اس گھریلو زندگی کو اچھی طرح دیکھ لیا ہوگا۔ یہ زندگی کوئی اتنی اچھی نہیں ۔ اس میں کوئی خاص جاذبیت نہیں ۔ ساس اور نند کے جھگڑے ۔ ساس اور بہو کے جھگڑے خاوند اور بیوی کے جھگڑے ،،،، پھر اقتصادی جھگڑے ، مزاج کی ناموافقت اور طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ۔ لیکن تم ایک ہندوستانی عورت ہو اور ہندوستانی عورت کے لئے شادی ہی زندگی کا سب سے بڑا عطیہ ہے اور اسی لئے تم نے اس زندگی کو اپنا لیا ہوگا ، نہیں تو اس کے سوا کیا چارہ ہے ۔

میں ابھی تک اکیلا ہوں ، بالکل اکیلا اور تنہا ۔ دن رات روشنی کا مینار میری آنکھوں کے سامنے ناچتا رہتا ہے ۔ میں اسے چھو نہیں سکتا ۔ اس تنہائی میں کبھی کبھی تم یاد آجاتی ہو صرف تم ہی نہیں بلکہ کچھ اور عورتیں بھی ۔ جن سے میں محبت کر چکا ہوں ۔ اب اُن سب کی یاد معدوم ہوتی جا رہی ہے ۔ اور اب یہ حالت ہے کہ نہ تو میں محبت کرسکتا ہوں اور نہ شادی ۔ اب صرف ایک جسم سے پیار کر سکتا ہوں جہاں میں آج کل رہتا ہوں وہ جگہ شہر سے الگ تھلگ ہے اس کے باوجود اس جگہ میں اتنی کشش ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی شاید اس جگہ میں اتنی کشش اور جاذبیت نہ ہوتی اگر سامنے والی کوٹھی میں ایک لڑکی نہ رہتی ہوتی جس کا میں ذکر کرنے والا ہوں ۔ ہمارے یہ پڑوسی نہایت امیر و کبیر ہیں ۔ ایک عالیشان کوٹھی میں رہتے ہیں باہر ہمیشہ کاریں کھڑی رہتی ہیں لیکن مجھے ان کاروں اور عالیشان کوٹھیوں سے دلچسپی نہیں بلکہ ایک لڑکی سے ہے جو اس کوٹھی میں رہتی ہے میں نے آج تک ایسی حسین و جمیل لڑکی کہیں نہیں دیکھی یہ لڑکی نہیں بلکہ ایک مکمل عورت ہے ۔ عورت اور لڑکی میں فرق ہوتا ہے بس وہی فرق جب تک تمہاری شادی نہیں ہوئی تھی تم لڑکی تھیں جب تم نے شادی کر لی تم عورت بن گئیں لیکن ہماری پڑوسن شادی کے بغیر ایک مکمل عورت ہے ۔ یہ ایک بیسویں صدی کا معمہ ہے ۔

ایک دن وہ مجھے بس میں مل گئی۔ جس حقارت سے اس نے میری طرف دیکھا وہ آج تک میرے سینے میں بچھو کے ڈنک کی طرح رینگ رہی ہے۔ اس نے یوں ہی سرسری نظروں سے میرے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ جیسے میری روح کپڑوں میں مقید ہے اور میرا جسم ایک بے جان شے ہے۔ وہ میری سُرخ نکٹائی دیکھ کر مُسکرائی جس کی گرہ زیادہ استعمال کی وجہ سے میلی ہو گئی تھی پھر اس کی نظر میرے ہیٹ کی طرف گئی جس کا اوپر والا حصّہ کافی دبا ہوا تھا۔ میں نے پتلون کی کریز کو درست کیا لیکن میرے بوٹ جن پر دو ماہ سے پالش نہ ہوئی تھی میری سراسیمگی پر خشمگیں ہو گئے۔ اس دن میں نے جرابیں بھی نہ پہنی تھیں دراصل میں جُرابیں پہنتا بھی نہیں اس دن مجھے اپنے جمالیاتی مذاق پر بہت غصّہ آیا۔ پتلون کے نچلے حصّے اور بوٹوں کے درمیان میری ٹانگوں کا حصّہ برہنہ تھا جس پر سخت سخت بال اُگے ہوئے تھے۔ بوٹوں کے تسمے میری آوارگی پر ایک قہقہہ لگا رہے تھے۔ شرم سے میں غرق غرق ہو گیا اور ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ میں نے اپنے بھونڈے پن کو چھپانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن مجھ میں اور اس لڑکی میں کافی تفاوت تھا۔ ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ اس کو پاٹنا میرے لئے ناممکن تھا۔ اس خلیج میں کاریں، کوٹھیاں، ڈنرسٹ، نوکر، نوکرانیاں، چاندی کے سکّے۔ بنک کے نوٹ، خوبصورت عورتیں، حریری پردے، وہائٹ ہارس۔ چھری کانٹے سب کچھ تیر رہے تھے اور میں دوسرے کنارے پر کھڑا تھا۔ اس کی اس تمسخر آمیز مُسکراہٹ کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن اس کی آنکھیں جن پر وہ ہمیشہ ایک آسمانی رنگ کا چشمہ چڑھائے رہتی ہے اصلیت کو چھپا نہ سکیں۔ وہ آنکھیں مغموم تھیں۔ اُن آنکھوں نے دُنیا کی خلا کو دیکھ لیا تھا۔ اتنی دولت ہوتے ہوئے اور حُسن کی فراوانی کے باوجود یہ آنکھیں بےچین تھیں۔ یہ آنکھیں اُداس تھیں ان میں زندگی کی لاحاصلی نمایاں تھی جیسے وہ کسی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں لیکن اندھی نہ ہو سکیں۔ چاندی کے سکّے بہت کچھ کر سکتے ہیں ان سکّوں سے خوشی کے لمحے خریدے جا سکتے ہیں۔ شاید اس نے بھی کسی کو چاہا اور اس کی محبّت پروان نہ چڑھ سکی۔ لڑکی نے مُنہ پھیر لیا اور ساتھ والی کرسچین لڑکی سے گفتگو کرنے لگی۔ لڑکی کی آنکھیں افسردہ ہو گئیں۔ اس کے دل کی گہرائیوں کا عکس اس کی آنکھوں میں تیر رہا تھا۔ اور آنکھیں صاف کہہ

رہی تھیں۔ کیوں جوانی کی اُمنگوں کو کچلا جائے۔ یہ جوانی کب تک رہے گی۔ یہ دُنیا ہر چیز کو بھول جاتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ کیوں نہ اپنے آپ کو ان رنگین پردوں میں چھپایا جائے۔ یہ سنہری نار یہ تھرکتے ہوئے بازو یہ ناچ گھر آنکھوں میں پیر کا ہلکا ہلکا نشہ۔ ٹانگوں کا تھرکنا اور کسی کے بازو کمر میں حمائل اور ناچنا پھر ناچ کر چور ہو جانا کیوں نہ اس زندگی کو اپنایا جائے۔ لیکن یہ نشہ ہر وقت قائم نہیں رہتا اور ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ امردگی لے لیتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، مجھے کیا، یہ عورت میرے دائرے سے باہر ہے۔ میرے حلقے سے باہر ہے۔ میں کبھی اس کے جسم کو چھو نہیں سکتا میں کسی کو پانے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔ جس کو حاصل کر سکتا تھا۔ جس کے ہونٹوں کو چوم سکتا تھا۔ اس کو دوسرے کے حوالے کر دیا۔ اور آج ایک ایسی عورت کو پانے کی تمنا رکھتا ہوں۔ جس کے ہونٹ دوسرے انسانوں کے لئے وقف ہو چکے ہیں لیکن انسان ہمیشہ اس چیز کو پانے کی کوشش کرتا ہے جو اسے ملتی نہیں۔ میں اپنی بے وقوفی پر ہنستا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیوں اکیلا ہوں۔ میں کیوں سایوں کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ میں کیوں نہ کسی کے جسم کو ہمیشہ کے لئے خرید لوں تاکہ اس ناختم ہونے والی افسردگی اور تنہائی سے رہائی پا سکوں۔ کیا میں ایسا کر سکوں گا۔ اور اگر کر بھی لیا تو تمھیں کیا ــــــ؟

⁂

طوفان کے بعد

میں تمھیں ایک عرصے سے خط لکھنا چاہتی تھی۔ گو تم سے جُدا ہوئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تم سے بہت دُور چلی گئی ہوں اور شاید اب میری اور تمھاری مُلاقات کبھی نہ ہو۔ گو اس بات کا اظہار ایک احمقانہ فعل ہے۔ اور یہ باتیں تم پر کوئی اثر نہیں کر سکتیں، لیکن میں کیا کر سکتی ہوں میں جو کچھ چاہتی وہ نہ ہوا۔ یہ خط تمھیں ملے گا بھی یا نہیں، اس کا بھی مجھے پتہ نہیں۔ کیوں کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم اب اس مکان سے کب کے بھاگ چکے ہو گے۔ جس طرح کہ میں اس رات اپنے مکان سے بھاگ آئی تھی۔ مجھے اپنے کیے پر بالکل ندامت نہیں، شاید ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ ہوا۔ اور آج جبکہ میں تمھیں اپنا آخری خط لکھ رہی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لینا کہ میں محبت کے زیرِ اثر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی۔ دُنیا کی نظروں میں شاید میں اپنا اثاثہ لُٹا چکی ہُوں۔ اور ماں باپ کی نگاہوں میں کافی گر گئی ہوں۔ لیکن دُنیا میں صرف ماں باپ ہی نہیں ہوتے۔ دُنیا میں صرف دُنیا والے ہی نہیں ہوتے۔ اپنا آپ بھی کچھ ہوتا ہے۔ اپنی انفرادی حیثیت بھی کچھ ہوتی ہے۔ اس خط کا صرف واحد مقصد یہ ہے کہ میں تمھیں بتاؤں کہ مجھے تم سے بالکل محبت نہ تھی۔ کہیں تم اس نشہ میں چُور نہ رہو۔ اور اپنے دوستوں سے اس مہم کو سر کرنے کی کہانیاں سُناتے رہو کہ کس طرح ایک لڑکی تم پر فدا ہوئی۔ اور وہ سب کچھ لُٹا بیٹھی۔ گو میں سمجھتی ہوں کہ ہندوستان میں جہاں عورت کو اس کی عصمت پر خریدا جاتا ہے۔ میں عورت کی عصمت کی قیمت کو جانتی ہوں۔ اور یہ

جانتے ہوئے بھی میں نے اپنے آپ کو کیسے تمھارے حوالے کر دیا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں - ہر بات کی وجہ ہوتی ہے ۔شاید تمھیں اپنی چالاکی یا ریاکاری یا لڑکیوں کو پھنسانے کی ترکیبوں پر ناز ہوگا اور تم سمجھتے ہوگے کہ تُم نے ایک تعلیم یافتہ لڑکی کو اپنی ہوس کا شکار بنالیا ۔لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تُم غلطی پر ہو۔ تُم نے مجھے غلط سمجھا ۔اگر میں یہ کہہ دوں کہ تُم مجھے سمجھ ہی نہ سکے تو یہ صاف بیانی ہوگی ۔اگر میں نے اپنے آپ کو تمھارے حوالے کیا تو اس کا باعث تُم نہ تھے ۔ بلکہ وہ ماحول جس میں ہم پلے بڑھے۔اور جس ماحول میں تُم ایکا ایکی آئے ۔ اور میرے جذبات کو تُم نے پھر سے بیدار کیا۔ جیسا کہ تُم جانتے ہو کہ میں متوسط طبقہ میں پیدا ہوئی ہوں اور متوسط طبقہ اپنے اخلاق کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے۔متوسط طبقہ کے لوگ اخلاق کی ترازو پر اپنے آپ کو جانچتے ہیں۔ اُن کے پاس سونا ہو یا نہ ہو۔ رتبہ ہو یا نہ ہو لیکن اخلاق کا طوق اپنی گردن میں ہمیشہ پہنے رہتے ہیں۔اور کبھی کبھی اخلاق کی یہ لمبی زنجیر اُن کے لئے موت کی زنجیر بن جاتی ہے ۔ یہ نام نہاد اخلاق جو ہمارے متوسط طبقے کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ہمارے لئے ضرر رساں ہے ۔میں واعظ کرنا نہیں چاہتی۔ نہ ہی سماج کی خامیاں کہنا چاہتی ہوں ۔ مجھے سماجی خامیوں سے کیا واسطہ ۔میں تو یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتی ہوں کہ میں نے جو قدم اُٹھایا وہ ہمارے سماجی ماحول کے عین مطابق تھا۔اس میں نہ تو تمھارے حُسن کی کشش کا اثر تھا اور نہ ہی تمھاری ذہانت اور ذکاوت کا ہاتھ اور مجھے تمھاری ذہانت کا کچھ اتنا علم بھی نہیں کہ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ تم ذہین ہو ۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ تُم نے بی۔ اے یا ایم۔ اے کر لیا ہے ۔ وہ ذہن کامل ہوسکتا ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے اور نہ تھا ۔اور نہ ہی مجھے ان یونیورسٹیوں پر اعتبار ہے ۔ یہ امتحان جو چند کتابوں کے رٹنے پر لئے جاتے ہیں ۔ ہماری ذہانت کا ثبوت نہیں ۔بلکہ ہماری سماجی بیوقوفی پر دلالت کرتے ہیں ۔خیر مجھے اس سے کیا واسطہ کہ تُم ذہین ہو یا نہیں ہو ۔میں تو کہہ رہی تھی کہ تُم کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ تمھاری خوبصورتی پر مرتے ہوئے میں تمھاری خواہشوں کا شکار ہوئی ۔اگر ایسا کرنا ہوتا تو کالج میں کسی حسین اور خوبصورت لڑکے سے محبت کر لیتی ۔ شاید اس وقت محبت کر سکتی تھی ۔ اب تو محبت سے کوسوں دور بھاگتی ہوں ۔

تو میں کہہ رہی تھی کہ تم اتنے حسین نہ تھے ۔ کہ میں تمھارے بغیر زندہ نہ رہ سکتی ۔ اور آن

واحد میں میں نے اپنے جسم کو تمہارے حوالے کر دیا۔ اور تم نے بغیر کسی حیل وحجت کے قبول کر لیا۔
ہاں میں کہہ رہی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی۔ ذہن میں خیالات اُمڈے چلے آتے ہیں اور کسی وقت خیالات گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ اور ذہن کی سطح پر پوری طرح نہیں اُبھرتے۔ ٹھہر جاؤ۔ ذرا سوچنے دو۔ ہاں میں کہہ رہی تھی کہ متوسط طبقے کے لوگوں کو اپنے اخلاق سے زیادہ محبت ہے۔ وہ ہر چیز کو اخلاق کے کانٹے پر پرکھتے ہیں۔ یعنی ان کی لڑکی اگر کسی نوجوان لڑکے سے گفتگو کرنے لگے۔ تو وہ جھٹ اس بات کو اخلاق پر تولتے ہیں۔ اگر گھر والوں کی نظروں میں یہ بات اخلاق پر پوری نہیں اُترتی جیسا کہ صاف ظاہر ہے کہ نہیں اُترے گی۔ تو وہ اپنی لڑکی کو اس جوان لڑکے سے گفتگو نہیں کرنے دیں گے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ گھر والوں نے مجھے کبھی کسی غیر شخص سے کلام کرنے کی اجازت نہ دی، اور نہ ہی میں نے ایسی اجازت طلب کرنے کی جرأت کی۔ اگر میں چاہتی تو ان باتوں کے لئے راستہ نکال سکتی تھی۔ لیکن دل ان باتوں کے لئے تیار نہ تھا۔ برسوں کی ذہنی غلامی نے دماغ پر ایک آہنی غلاف چڑھا دیا تھا۔ جس کو مغربی تعلیم کی بی۔ اے کی ڈگری بھی نہ توڑ سکی۔ تم تو پوچھ سکتے ہو کہ بھلا میں خود بی۔ اے میں پڑھتی رہی اور وہ بھی بھگوان داس کالج میں جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں۔ تو پھر بھی مجھے یہ جرأت نہ ہو کہ کسی لڑکے سے آشنائی کر لیتی۔ محبت کی پینگیں بڑھاتی۔ رات کے اندھیرے میں کسی کے ساتھ سینما چلی جاتی اور بہانا بنانا تو مشکل بات نہیں۔ گھر والوں سے کہہ دیا کہ کالج میں لڑکیوں کا ڈرامہ ہے۔ یا فلاں پروفیسر کو لٹریچر پر شاندار لیکچر دینا ہے۔ ہزاروں بہانے بنائے جا سکتے ہیں جو میں یہاں نہیں لکھنا چاہتی۔ اور کسی شام کو اپنے نئے ساتھی کے ساتھ لارنس باغ کی سیر کو جاتی۔ عورتیں بہترین ساڑیاں پہنے ہوئے اس جنت مقام پر آتی ہیں۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مہکی مہکی خوشبو۔ رنگ برنگ کی ساڑیاں۔ نیلی پیلی ارغوانی۔ ہواؤں میں لہراتے ہوئے بال اور لڑکوں کا جمگھٹا۔ بہترین سوٹوں میں ملبوس ٹائیاں ہوا میں اُڑ رہی ہیں اور غول کے غول ادھر اُدھر لڑکیوں کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ لڑکیاں خوش ہوتی ہیں۔ ہنستی ہیں دل میں اُمنگیں اُٹھتی ہیں۔ جسم میں گدگدی ہوتی ہے۔ کسی سے آنکھیں ملتی ہیں۔ جیسے تم نہیں جانتے۔ اور شاید وہ پھر

مل نہ سکے ۔ اور کبھی ملتے بھی نہیں ۔لیکن کسی کی آنکھیں بار بار تمھاری طرف اٹھتی ہیں ۔ تمھارے قدم جلدی جلدی اُٹھتے ہیں اور اپنی سہیلیوں کو ساتھ لے کر وہ اوجھل ہو جاتی ہیں ۔ باتیں ہوتی ہیں اور ہر روز ہوتی رہیں گی چاہے متوسط درجے کے لوگ چیخ چیخ کر مر جائیں ۔ چاہے وہ دُنیا کے بہترین شاعروں کی غزلوں کو آگ کی نذر کر دیں ۔ چاہے وہ فحاشیوں کی کتابوں کو قابلِ ضبطی قرار دیں ۔لیکن یہ کشش جو ایک جوان عورت اور مرد کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے سے ہوتی ہے ۔ یہ کبھی نہیں مر سکتی یہ ایک فطری ضرورت ہے جس سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے ۔ یہ متوسط طبقے کے لوگ جن پر اخلاق ایک ہوّا بن کر چھا گیا ہے ۔ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بہو بیٹیوں کے دماغ میں ایسے خیالات نہ آئیں ۔ یہ چاہتے ہیں کہ گو وہ ہر سال ایک بچّہ پیدا کریں ۔لیکن ان کی لڑکیوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ یہ بچے کہاں سے آتے ہیں، کسی کا گرم سانس انھیں نہ چھو جائے ۔کسی غیر انسان کی آنکھیں ان کی لڑکیوں پر نہ پڑ جائیں ۔ یہ گندے ناولیں نہ پڑھیں ۔ یہ عشقیہ نظمیں نہ سُنیں ۔ یہ کسی خوبصورت لڑکے کو دیکھ کر خوش نہ ہوں یہ موسیقی کی طرف رجوع نہ ہوں ۔ یہ ناچ کو نہ اپنائیں ۔لیکن اس کے باوجود بھی سب کچھ ہو رہا ہے ۔ لڑکیاں ناچتی ہیں ۔ گاتی ہیں ۔کسی کی خمار آلود نگاہوں کے تلذذ سے محفوظ ہوتی ہیں ۔ رات کی تاریکیاں ان کے لئے بوجھل بن جاتی ہیں ۔ اور وہ تصوّرات کی دُنیا میں کھو جاتی ہیں ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں کبھی نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ ہو کر رہے گا ۔ یہ متوسط طبقے اپنے بچّوں کی زندگیوں کو برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں ۔ اُف یہ اخلاق !لیکن تمھیں اخلاق سے کیا تعلق تم اخلاق سے کوسوں دور بھاگتے ہو ۔ میں کتنی خوش ہوں کہ تُم اخلاق سے بالاتر ہو ۔ اور تم نے مجھے اخلاق سے بالاتر کر دیا ۔لیکن کیا دُنیا میں اخلاق کوئی چیز نہیں ۔ بحث کی ضرورت نہیں ۔ بند و نصیحت کا وقت نہیں اور میں کیا نصیحت کر سکتی ہوں اور نہ ہی میں نصیحت پر یقین رکھتی ہوں ۔ میں ان ناصحوں سے کوسوں دُور بھاگتی ہوں ۔ "یہ نہ کرو ۔ وہ نہ کرو ۔ فلاں بزرگ نے یہ کہا ہے کہ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے ۔ مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا کتابیں ۔ مذہب ۔ بزرگ ....."

خیر میں کہہ رہی تھی کہ طالب علمی کے زمانے میں کسی نوجوان نے مجھ سے محبت کرنے کی ہمت

نہ کی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں بدصورت تھی، تھی نہیں بلکہ ہوں، اس کا تمھیں علم بھی ہے۔ اور میری بدصورتی کا فائدہ تم نے جس طرح اٹھایا اُس کی بھی داد دیتی ہوں۔ میں بدصورت کیوں ہوں اس کی بھی وجہ ہے۔ تم شاید میری باتوں سے چڑ جاؤ اور خط کو پڑھے بغیر پھینک دو۔ اور دل میں سوچو کہ کیا ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ لیکن میرا آخری خط پڑھنے میں تمھیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ میرا آخری خط ہے۔ تمھیں ان خوبصورت لمحوں کی قسم جن کی یاد میرے ذہن پر مرتسم ہے۔ سچ کہتی ہوں میں وہ لمحے زندگی بھر یاد رکھوں گی۔ میں ان حسین لموں کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ وہ میری زندگی بھر کا بہترین سرمایہ ہیں۔ وہ میری جوانی کی اوّلین اور آخری اُمنگوں کا نچوڑ ہیں۔ میں نے ان لمحوں سے کتنا خط اُٹھایا تھا اس کا میں بھی ذکر کروں گی۔ چاہے متوسط درجے کے لوگ مجھے فاحشہ ہی کیوں نہ کہدیں۔ پہلے میں یہ بتادوں کہ میں بدصورت کیوں ہوں میری ماں! تم نے دیکھی ہے نا! مجھے اپنی ماں سے محبت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی ماں کی بُرائیوں کو نہیں جانتی۔ اس کے عیب مجھ سے چھپے نہیں ہیں۔ وہ نہایت موٹی اور بھدّی عورت معلوم دیتی ہے کہو تو اس کے جسم کی ہر نقش کو یہاں بیان کردوں۔ لیکن مجھے متوسط درجے کے لوگوں کا خیال ہے۔ کہ کہیں مجھے زندہ پھانسی پر نہ لٹکا دیں۔ صرف اس قصور پر کہ ایک بیٹی ہوکر اپنے ماں باپ کے نقائص بیان کرتی ہے۔ اور میرا باپ میری ماں سے بھی بدصورت چھوٹا قد، چہرہ لٹکا ہوا۔ گال اندر دھنسے ہوئے۔ پتلا سا جسم۔ جس میں ہڈیاں تک نظر آتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی خُدا نے میرے باپ پر ایک کرم اور کیا۔ کہ اس کی دائیں ٹانگ بائیں ٹانگ سے چھوٹی بنادی۔ جب وہ چلتے تو میں "وہ چلنا" یہاں لکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے دُنیا والوں کے اخلاق کا پاس ہے۔ جب وہ چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے —— جیسے لگڑ بھگڑ یا چرخ۔ خیر یہ میرے باپ کی دوسری شادی ہے۔ پہلی شادی سے کوئی لڑکا نہ تھا۔ لیکن میرے باپ کو یہ فکر ہوئی کہ اتنی جائیداد کون سنبھالے گا۔ اتنا بڑا دو منزلہ مکان۔ ایک کنواں۔ اتنی زمینیں جو اپنا خون چوس چوس کر خریدی گئی تھیں۔ ان کا کون مالک ہوگا۔ اور پھر دنیا والوں کے طعنے۔ اور کیا طعنے تھے۔ کہ میرا باپ کمزور ہے۔ اس لئے وہ بچّہ پیدا کرنے

کے ناقابل ہے۔ لیکن کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ ایک انسان ہو، گورنمنٹ سروس کرتا ہو، زمین ہو، مکان ہو اور لڑکا نہ ہو۔ اور طعنے۔ مجبوراً میرے باپ نے دوسری شادی کی۔ اور خدا بھلا کرے۔ ان محلّے والوں کا کہ دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ خدا خدا کر کے لوگوں نے طعنے دینے بند کئے اور متوسط درجے کا اخلاق بامِ عروج پر پہنچ گیا۔ میرے باپ کی عزت رہ گئی۔ اور اُجڑا ہوا گھر بس گیا۔ اکثر میرے ماں باپ میں لڑائی ہوا کرتی تھی۔ اکثر میری ماں کہا کرتی تھی۔ کہ انھیں اپنی صحت کا خیال نہیں۔ دن رات دفتر کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ گھر کا ذرا خیال نہیں۔ بس ایک چپاتی کھاتے ہیں۔ ایک روٹی سے کیا بنتا ہے۔ فروٹ جوس نہیں پیتے۔ دودھ نہیں پیتے۔ مکھن نہیں کھاتے اور تو کیا تیل کی مالش نہیں کرتے۔ ہمارے پڑوس میں انہی کے عمر کے بابو رہتے ہیں۔ کیا نام ہے ان کا۔ بھلا سا نام ہے۔ میں نے ان کی شکل تک بھی نہیں دیکھی۔ مجھے کیا واسطہ ان کی شکل سے۔ لیکن نہایت خوبصورت اور خوش شکل ہیں۔ جسم بھرا بھرا سا۔ چوڑا چکلا سینہ۔ بازو موٹے موٹے گٹھے ہوئے۔ اور آنکھیں۔ آنکھوں میں چمک۔ گال سُرخ اور کیا بتاؤں کتنی اچھی صحت ہے۔" اور میں دل میں سوچتی ماں کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ابھی ابھی وہ کہہ رہی تھیں۔ کہ انھوں نے بابو صاحب کی شکل تک نہیں دیکھی۔ لیکن اس وقت تو وہ بابو صاحب کے ہر حصّے کو اس طرح پہچانتی ہیں جیسے انھوں نے ڈاکٹری معائنہ کیا ہے۔ لیکن یہ سوال کرنا اخلاق سے بعید ہے۔

⁂

ازبس یہ کہ تم میری بدصورتی کی وجہ سمجھ گئے۔ یہ وراثت سے ملی ہے۔ اس میں میرے باپ کا قصور نہیں۔ کہ انھوں نے کیوں ایک دوسرے سے شادی نہ کرتے تو کوئی اور میری ماں سے شادی نہ کرتا۔ میں اگر حساس نہ ہوتی یا خوبصورتی سے مجھے اتنا لگاؤ اور دلچسپی نہ ہوتی تو شاید مجھے اپنے بھدّے پن پر اتنا ناز تھا کہ جتنا ایک خوبصورت عورت کو اپنی خوبصورتی پر ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کرتی۔ میرے سوچنے کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ مجھے بدنما چیز اچھی نہیں لگتی۔ مجھے خود اپنے آپ سے نفرت تھی۔ گو میں اتنی بدصورت نہ تھی۔ جتنی کہ میں بن رہی ہوں۔ تو شاید تم میری طرف مائل نہ ہوتے۔ میری طرف مائل ہونے کی ایک

وجہ یہ بھی تھی کہ میں آج تک کسی طرف مائل نہ ہوئی تھی۔ سچ جانو کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد تک میں مرد کے گرم سانس سے نا آشنا تھی۔ اور جب میں بی۔ ٹی کر چکی تو میری خواہش کچھ مُردہ ہو چکی تھی۔ زندگی کی پیہم شکستوں نے مجھے بے جان کر دیا۔ گھٹے ہوئے ماحول نے اُمنگوں کا کچومر نکال دیا۔ جوانی آئی اور آئی بھی کیوں کر۔ جسم کی ہر رنگینی جذبات کے مسلے جانے سے فنا ہو گئی۔ اعصاب پورے طریقے سے نشوونما نہ پا سکے۔ آنکھوں کی چمک کسی انتظار میں غائب ہو گئی۔ شباب کی رنگینی جو ایک کنواری عورت کے چہرے پر ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اُڑ گئی۔ ہونٹ خشک ہوتے گئے۔ بانہوں پر گوشت نہ چڑھ سکا۔ مجھے ان دنوں کسی سے محبت نہ تھی۔ لیکن ذہن میں ایک پریشانی دبی رہتی تھی۔ سر پر ایک جنون سوار رہتا تھا۔ میرے خیالات اگر متوسط درجہ کے اخلاق پر تولے جائیں تو مجھے کہنا پڑے گا کہ میرے خیالات ہمیشہ پراگندہ رہتے تھے۔ یہ پراگندگی میرے جسم کا حصہ بن گئی۔ میرے جسم کے ہر حصّہ پر چھا گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس پراگندگی کی یہ تشکیل ہوئی کہ میں اس جوتے کی طرح دکھائی دینے لگی جو عرصہ تک دھوپ میں پڑا رہنے سے بد وضع اور بیڈول ہو جاتا ہے۔ میرے ذہن میں خیالات مردہ ہو چکے ہیں۔ اور پراگندگی کا اثر اعصاب پر ہو چکا تھا۔ جنسی خواہشیں ایک طرح سے" ——— "ہو چکی تھیں یا یوں کہا جائے کہ جنسی خواہشوں کو ماحول نے اُبھرنے نہ دیا لیکن فرائڈ کے کہنے کے مطابق جنسی خواہش مرتی نہیں۔ دبائی جاتی ہے۔ شاید یہی حالت تھی گو احساسات۔ اُمنگیں۔ آرزوئیں اُبھر اُبھر کر شل ہو چکی تھیں لیکن ایک چنگاری کسی کونے میں دبی ہوئی تھی۔ میری حالت اس جلے ہوئے اُپلے کی طرح تھی۔ جو اوپر سے بالکل راکھ دکھائی دیتا ہو۔ لیکن جس کے ——— اندر ہی اندر چنگاری سُلگتی رہے۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ تم نہ آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ تم نہ آتے تو تمھاری جگہ کوئی اور آجاتا ——— تم اتنے خوش شکل تو نہ تھے کہ تم مجھے بھا جاتے۔ گو تمھارا قد کافی لمبا تھا۔ تمھارا جسم بھرا ہوا لیکن تمھارا چہرہ عجیب بیڈول سا بے ڈھنگا سا۔ یوں مجھے کچھ بھایا نہیں۔ سچ کہتی ہوں۔ بُرا نہ مانو۔ اور پھر تم نے میری جانچ پڑتال بھی نہ کی۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی کہ تم جیسے لڑکے مجھے ہمیشہ نظر انداز کر دیتے۔ کیوں؟ میں ایک ہی نظر میں بھانپ گئی تھی کہ تمھیں اپنی خوبصورتی کا ناز

ہے۔ اور پھر تمہارے دوست بھی کتنے بھونڈے اور بھدے تھے۔ وہی واسدیو اس کی شکل مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتا تھا۔ اور کئی بار راستہ میں کھڑے ہو ہو کر ہنستا رہتا تھا۔ یا کبھی مُسکرا دیتا تھا۔ یا کبھی اپنے دوست کو آواز دیتا۔ تاکہ میں اس کی طرف دیکھوں۔ اور کتنے ہی حیلے جتن کرتا۔ مگر آج کل کی لڑکیاں یوں نرغہ میں نہیں آتیں اور پھر واسدیو جیسے نامعقول آدمیوں سے انھیں کیا لگاؤ ہو سکتا ہے۔ تم اکثر چپ رہتے ہو ۔ یُوں تُم تُم جیسے تمھیں میرے وجود کا علم ہی نہیں اور نہ ہی میں تمھیں اپنے وجود کا احساس کرانا چاہتی تھی۔ مجھے تُم سے محبت نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ماحول نے ہم دونوں کو غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کا احساس کر دیا۔ یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے وجود کا احساس نہ کرتے اور اس وجود کا احساس دن بدن شدید ہوتا گیا۔ جوں جوں دن گذرتے گئے تمھارا وجود میرے ذہن پر ایک کابوس بن کر چھا گیا اور جب تُم اکیلے رہ گئے اور تمھاری اماں کسی ضروری کام سے کسی دوسرے شہر چلی گئیں تو تمھارا وجود میرے لئے ایک بوجھل غبارہ بن گیا۔ درمیانی طبقے کی گرفت کچھ ڈھیلی نظر آئی۔ اگر تُم مجھے بالکل تنہا اور اکیلے نظر آتے۔ اکثر تم رات کے وقت دیر تک پڑھتے رہتے تھے۔ پتہ نہیں کیا پڑھتے رہتے تھے لیکن مجھے یہ صاف معلوم ہے کہ تم اکثر اس وقت بجلی بجھاتے جب میں بیڈنگ لیمپ کو بجھاتی۔ میں نے پہلے اس بات کو یونہی نظر انداز کر دیا۔ لیکن بعد میں سوچنے لگی۔ کہ تُم کیوں جاگتے ہو۔ لیکن میں نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ میں کیوں جاگتی رہتی ہوں۔ میں کیوں پہلے نہیں سو جاتی۔ اور کیوں تمھارے لیمپ کی روشنی کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں ایک ہی لیمپ کی روشنی میں پڑھ رہے ہیں۔ اور جب لیمپ کی روشنی بجھ جاتی اور میرے ارد گرد اندھیرا ہو جاتا تو میں گھبرا جاتی۔ اور میں سوچتی کہ میں اکیلی ہوں اور کبھی آسمان کی طرف دیکھتی کہ جو ستاروں سے اَٹا ہوا معلوم ہوتا اور کبھی کبھی کوئی ستارہ ٹوٹتا اور افق کی طرف بھاگتا ہوا چلا جاتا۔ اس کے پیچھے پیچھے روشنی کی ایک لکیر آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی۔ دور اس پار محلے کے کتے کے بھونکنے کی آواز چوکیدار کے چلانے کی آواز میں مدغم ہو جاتی۔ ذہن پر ایک تاریکی چھا جاتی اور میں دیر تک جاگتی رہتی۔ حتیٰ کہ مشرق سے سورج انگارہ بن کر نکل آتا۔ اور اس کی نکیلی

کرنیں میرے پریشان ۔ تھکے ہوئے چہرے پر پڑتیں ۔ اکثر میں سوچتی کہ میں اکیلی ہوں اور تم اس کمرے میں اکیلے ہو اور پھر ہم دونوں اکیلے ہیں ۔ یہ کیوں ہے ۔ ایسا کیوں ہے ؟ مجھے تم سے محبت بالکل نہ تھی ۔ اور اب بھی نہیں ہے ۔ لیکن غیر شعوری طور پر میں تمھاری کھنچی چلی گئی ۔

اور پھر اس دن کی بات ہے ۔ دن نہیں بلکہ رات تھی ۔ کیا تاریخ تھی ؟ تمھیں یاد نہ ہوگی ۔ مجھے یاد ہے ۔ ۱۹، مارچ ۱۹۴۲ء شاید تم اس تاریخ کو بھول گئے ہو گے ۔ لیکن مجھے یہ رات نہیں بھول سکتی ۔ اس رات صدیوں کے بنائے قوانین ایک عورت کو نہ جکڑ سکے ۔ اس رات مجھے یہی خیال آتا رہا کہ تم اکیلے ہو ۔ اور میں تمھارے پاس چلی آؤں اور کہوں کہ آؤ مجھے پیار کرو ۔ تو تم کیا کہو گے ۔ ہو سکتا ہے کہ اگر تم کسی رات میرے پاس آجاتے تو چیخ اٹھتی اور کہتی کہ یہ چور ہے اس نے میری عصمت کو چھینا ہے ۔ لیکن میں تمھارے پاس اکیلی آجاؤں اور میں یہ سوچتے سوچتے پڑھنے لگی ۔ لیکن دماغ میں الفاظ پھیلتے چلے گئے ۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا ۔ جیسے میں ایک بڑی چٹان سے پھسل رہی ہوں ۔ تم ابھی تک نہ آئے تھے ۔ پہلے تو تم آجاتے تھے ۔ آج تم نے کیوں میری بلا ـــــ میں نے سوچا مجھے کیا پروا ۔ تم آؤ یا نہ آؤ ۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن دل جاگنے پر مصر تھا ۔ دل کہہ رہا تھا انھیں آنے دو ۔ ابھی آجائیں گے ۔ نوکر نے دروازہ بند کر دیا ۔ وہی بڑا دروازہ ۔ میں نے سوچا ۔ اب تمھارے آنے کا کوئی امکان نہیں ۔ اب مجھے سو جانا چاہیئے ۔ میں نے لیمپ گل کر دیا اور بستر پر دراز ہوگئی ۔ آسمان پر تارے میرا منہ چڑانے لگے ۔ یہ اندھیرا یہ گھپ اندھیرا روشنی کہیں بھی نہیں گھڑیوں نے بارہ بجائے ۔ نیچے دالان میں کسی کے فراٹے کی آواز آنے لگی ۔ ساری دنیا سو رہی ہے ۔ لیکن میری آنکھوں میں نیند عنقا تھی ۔ اور پھر یہ ذہنی پریشانی ۔ جیسے میں کسی دلدل میں دھنسی جا رہی ہوں ۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ میں چپ رہی ۔ کتا ہوگا ۔ میں نے سوچا ۔ پھر کسی نے آواز دی ۔ یہ تمھاری آواز تھی ۔ میں نے سوچا نوکر دروازہ کھول دے گا ۔ لیکن تم آوازیں دیتے رہے اور صحن سے خراٹوں کی آواز آتی رہی ۔ میں نے سوچا کیوں نہ دروازہ کھول دوں ۔ دل نے کہا اور میں چپکے سے اٹھ کر نیچے چلی گئی ۔ اور دروازہ کھولا ۔ دروازہ کھلتے ہی تم نے

ٹارچ جلائی۔ جیسے کوئی بھولا بھٹکا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔

"اِدھر اُوپر۔" میں نے زیرِ لب کہا کہ۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ ٹانگوں میں ایک بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ کنپٹیاں جلنے لگیں اور گلے سے ایک لیس دار لعاب نکلتا ہوا معلوم ہوا۔ اور پھر تاریکی ...
..... اس تاریکی میں کیا ہوا۔ یہ تُم جانتے ہو۔ شاید اس سے پہلے تُم کسی عورت سے ہمکنار ہو چکے ہو گے۔ لیکن میرے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ تمھارے ہونٹ خُشک اور باسی تھے۔ اور اُن میں بیئر کی خوشبو آ رہی تھی۔ اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ تُم بیئر بھی پیتے ہو۔ میں اُس دن زندگی کی مٹھاسوں سے آشنا ہوئی۔ تمھارے وجود نے جو میرے جسم سے ہمکنار تھا۔ میری روح پر ایک نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ اور تُم دیر تک میرے پریشان بالوں سے کھیلتے رہے۔ میں نے تمھارے ہونٹوں کو چُوما۔ تمھارے گالوں، تمھاری گردن چُوم چُوم کر چور ہو گئی اور سچ کہتی ہوں آج تک تمھارے ہونٹوں کا مزہ میرے ہونٹوں پر موجود ہے۔ ابھی تک میرے ذہن میں تمھارے جسم کی بساند تر و تازہ شیریں اور گرم۔

دور آسمان پر تارے مُسکرا رہے تھے۔ ہوا میں ایک نیند سی رچی ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ تمام دُنیا اسی طرح سوتی رہے اور یہ رات ایک مسلسل رات بن جائے۔ مجھے کتنا سکون نصیب ہوا۔ مجھے کتنی خوشی ہوئی اسے میں ہی جانتی ہوں۔ چاہے تو اسے مٹتے ہوئے شباب کی تاثیر سمجھ لو۔ یا ایک جوان عورت کی بیوقوفی کا مرقع۔ لیکن وہ ضرور خوشی کے لمحے تھے۔ مجھے زندگی بھر کبھی اتنی مسرت حاصل نہ ہوئی تھی۔ میری زندگی کے تار کبھی اس طرح کانپے نہ تھے۔ اس دن تُم نے مجھ سے محبت کر کے اس لازوال مسرت کی لذت کو آشنا کر دیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ محبت جاودانی ہو جاتی۔ یہ رشتہ ہمیشہ کے لئے پکا ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ دن گزرتے گئے اور مجھے اپنی وحشیانہ غلطی کا خمیازہ بُھگتنا پڑا۔ میں نے تُم سے کہا کہ تُم میری مدد کرو۔ تُم نے انکار کر دیا۔ مجھے تمھارے انکار سے حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے اُمید تھی کہ ایسا ہی کرو گے۔ اور پھر ایسا کیوں ہو۔ کیا دُنیا میں کبھی ایسا نظام نہ ہو گا۔ جہاں مرد اور عورت تاروں کی چھاؤں میں اکٹھے رہ سکیں گے۔ اور دُنیا کے یہ بنائے ہوئے قانون کبھی رخنہ انداز نہ ہو سکیں گے۔ جس صبح میں بھاگی۔ اس وقت چاروں طرف میلا میلا اندھیرا تھا۔

ہوا میں اسی گھٹے ہوئے ماحول کی بدبو آرہی تھی اور آسمان پر چاند یاس وحسرت کا مرقع بنا ہوا تھا۔
ایکا ایک چاند پر سیاہ بادل چھا گئے۔ اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ کسی نے مجھے نہ بلایا۔ اور تم
کہاں تھے؟ اس نے سوچنے کی کوشش کی۔

میں اب کیا کہوں اور کیا کرتی ہوں شاید تم جاننا چاہو۔؟ میں ایک معمولی سے اسکول میں
استانی ہوں۔ اور میرے ایک بچہ ہے۔ ایک چھوٹا سا پیارا بچہ۔ اس کی آنکھیں تم سے ملتی ہیں۔
لیکن تمھیں اس سے کیا غرض۔!
کبھی کبھی وہ آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہتا ہے " ماں۔ ابا۔؟ ابا۔؟ اور میں کبھی کبھی سوچتی
ہوں کہ کیا ہی اچھا ہو۔ کہ اس دنیا میں نہ مائیں ہوں نہ باپ صرف انسان اور بچے۔

☆

زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

اس نے نیا سوٹ پہنا۔ اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ سر کے بال کچھ بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بُرش سے بالوں کو اپنی جگہ جمایا ___ اور سر کو جھٹک کر پھر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا ___ اسے اپنی ناک کچھ لمبی سی دکھائی دی۔ کاش اس کی ناک اتنی لمبی نہ ہوتی۔ تو اس کی زندگی خوش گوار ہو جاتی۔ سر پر فیلٹ رکھ کر اس نے ایک شعر گنگنانا شروع کیا۔ بیگ میں کچھ کاغذات رکھے۔ اور نوکر کو چند ہدایات دینے کے بعد سیڑھیاں اُترنے لگا ___ ؟ آج وہ خوش تھا اس کے نوکر نے نہایت ہی لذیذ کھانا پکایا تھا۔ اور اس نے پیٹ بھر کر کھایا تھا ___ وہ جلدی سیڑھیاں اُتر گیا۔ اور اپنی پُرانی کار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گو کار پُرانی تھی۔ لیکن آج کل کار سستے داموں میں کہاں ملتی ہے۔ بڑی کوششوں کے بعد اسے یہ کار ملی تھی۔ کار خریدنے کے بعد لوگوں میں اس کی عزت اور توقیر بڑھ گئی تھی۔ کہاں تو دوست یار اسے انشورنس ایجنٹ کہہ کر ذلیل کرتے تھے۔ کہاں اب وہی دوست اس سے ملنا اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ اور اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ اور ہینڈل کو رومال سے صاف کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ کدھر جائے۔ یونہی اسے خیال آیا۔ کہ پہلے کار میں بیٹھ جائے۔ پھر سوچے گا کہ اسے کدھر جانا ہے۔ کار میں بیٹھے ہوئے اُسے چند سیکنڈ ہی گذرے تھے کہ اسے پسینہ آنے لگا۔ اس نے ہینڈل

گھمایا اور کار کو اسٹارٹ کر دیا ۔ اور ایک پچھلتی ہوئی نگاہ ساتھ والے مکان پر ڈالی ۔ یہاں اس کا دوست نریندر رہتا تھا ۔ کیوں نہ اُسے بلا لے ۔ اور دونوں سیر کرنے چلیں ۔ کمبخت سو رہا ہو گا یا کوئی کتاب پڑھ رہا ہو گا ۔ یا کوئی بیہودہ سی کہانی لکھ رہا ہو گا ۔ کہتا ہے کہ میں افسانہ نگار ہوں ۔ ایسے افسانہ نگار بہت دیکھے ہیں اس کی زندگی اس فلیٹ میں گزر جائے گی ۔ کسی سے ملتا بھی تو نہیں ۔ ترقی کیسے کرے گا ۔ لعنت بھیجو اس پر ۔ مرنے دو کمبخت کو ۔ اسے اپنی اقتصادی حالت کو دوسروں سے بہتر دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی ۔ ہینڈل کو گھماتے ہوئے وہ کار کو آگے لے گیا ۔ اب کار آہستہ آہستہ جا رہی تھی اور وہ سگرٹ کا دھواں کار میں بکھیر رہا تھا ۔ آج وہ خوش تھا ۔ بے حد خوش تھا ۔ زندگی گزر رہی تھی ۔ اچھی گزر رہی تھی جب انسان کا پیٹ بھرا ہوا ہو اور بٹوے میں چاندی کے سکّے ہوں اور کار بھی ہو ۔ اور وہ دیکھ رہا ہو کہ اس کے بھائی پیدل چل رہے ہیں اور اس کی کار خراماں خراماں آگے بڑھ رہی ہے تو اس کی خوشی کی کیا انتہا ہو سکتی ہے ۔ اس نے سوچا کہ وہ ان سے کئی درجے بہتر ہے ۔ احساس برتری سے اس نے گردن کو اکڑا لیا اور سگرٹ کے دھوئیں کو زور سے چھوڑتے ہوئے کار کی رفتار کو تیز کر دیا ۔ ہوا خوشی سے گاتی ہوئی اس کے قریب سے گذر گئی ۔ اب وہ اور قریب آ رہا تھا ۔ اور قریب آ رہا تھا ۔ اب خُداداد سرکل آ گیا تھا ۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے بائیں طرف دیکھا ۔ دو خوبصورت آنکھیں اسے دیکھ کر مُسکرا رہی تھیں " مجھے " اس نے سوچا جیسے اسے ان آنکھوں پر یقین نہ آیا ہو ۔ اور وہ کار کو گھما کر آگے بڑھ گیا ۔ وہ سوچ رہا تھا ۔ اور کار آگے بڑھ رہی تھی ۔ وہ کیا کرے کیا واپس مُڑ کر لڑکی کے قریب سے گزرے ۔ شاید وہ پھر مُسکرائے ۔ لیکن اسے خیال آیا ۔ کہ اس کی ناک بلی ہے ۔ کوئی لڑکی اسے دیکھ کر مُسکرا نہیں سکتی ۔ کئی بار وہ اس کار میں بیٹھ کر اس سرکل کے قریب سے گزرا ہے لیکن کسی لڑکی نے اس کی طرف مُسکرا کر نہیں دیکھا تھا ۔ لیکن اس وقت اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ میاں چلو ایک بار پھر اسی لڑکی کے قریب سے گزرو ۔ اس نے ہینڈل کو گھمایا اور کار پھر واپس چلی ۔ اب کے لڑکی پھر مُسکرائی ۔ اس نے کار روک لی ۔ اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا ۔ اس کی پریشانی کی حد نہ رہی جب معلوم ہوا کہ ایک کے بجائے دو لڑکیاں پچھلی

سیٹ پر آ گئی تھیں ۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے کار کا دروازہ بند کیا ۔ اور لڑکیوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی ۔ لڑکیاں پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں ۔ اور وہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا کار کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا ایک مرد اور دو عورتیں یہ ایک خطرناک مثلث تھی ۔ وہ تو صرف ایک لڑکی چاہتا تھا ۔ وہ کس طرح اور کیوں آ گئیں ۔ وہ ان سے کیا کہے ۔ بڑے سوچ بچار کے بعد اس نے "ہیلو" کہا ۔ اور اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا اس نے مڑ کر دیکھا دونوں لڑکیاں پھر مسکرا رہی تھیں وہ کچھ گھبرا سا گیا ۔ ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا اور ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی ۔ اس نے فوراً بریک لگا دی ۔ ایک اینگلو انڈین لڑکی کار کے نیچے آتے آتے بچ گئی تھی ۔ اینگلو انڈین لڑکی نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"یو فول" ـــــ

"آئی ۔ ایم ۔ ساری" اس نے کہا ـــ اور کار کو پوری رفتار سے چھوڑ دیا ۔ دونوں لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں لیکن ان کی باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں ۔ اس نے کنکھیوں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا ۔ اب کے اس کے ہاتھوں نے بڑی مضبوطی سے ہینڈل پکڑ رکھا تھا ۔ لڑکیاں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں ۔ مسکرا رہی تھیں ۔ ایک لڑکی نے آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے کہا "ہیلو" یہ سنتے ہی وہ خوش ہو گیا ۔ اور اسے محسوس ہوا کہ آج اس کی ناک چھوٹی ہو گئی ہے ۔ اور اگر لڑکیاں اس طرح اس پر مہربان ہوتی گئیں تو ایک دن اس کی ناک بالکل غائب ہو جائے گی ۔ لیکن اس خطرناک مثلث کا کیا علاج ہو گا ۔ ایک مرد اور دو عورتیں وہ ان سے اکیلا کیا بات کرے ۔ دونوں لڑکیاں پارسینں تھیں ۔ دونوں خوش شکل تھیں ۔ خوبصورت تھیں ۔ دونوں مسکرا رہی تھیں ۔ دونوں کے بال کٹے ہوئے تھے ۔ اور دونوں نے سکرٹ پہنی ہوئی تھیں ۔ دونوں کی ٹانگیں ننگی تھیں ۔ سپید تھیں ۔ آنکھوں میں شوخی تھی ۔ شرارت تھی ۔ لبوں پر لپ اسٹک تھی ۔ سیاہ بالوں میں جوانی کی چمک تھی ۔ آج تک کسی خوبصورت عورت نے اس سے بات تک نہ کی تھی ۔ یوں تو فارس روڈ پر وہ کئی بار چکر لگا چکا تھا ۔ لیکن وہ پڑھی لکھی لڑکیوں خوش پوش پارسنوں اور خوبصورت لڑکیوں کی محبت سے

بالکل بے گانہ تھا۔ اگر ایک لڑکی ہوتی تو وہ اسے اپنے پاس بٹھا لیتا ــــ یہ سوچتے سوچتے وہ اپنے گھر کے قریب آگیا۔ اور کار کو روک لیا۔

"تمھارا نام ــــ" ؟

"کٹی" لڑکی نے جواب دیا ــــ"

"اور تمھارا ــــ" ؟

"لمٹی ــــ"

"کٹی اور لمٹی ۔ لمٹی اور کٹی ــــ" وہ بڑبڑایا ــــ کٹی لمٹی سے زیادہ خوبصورت تھی۔ زیادہ چالاک تھی ۔ اس کی آنکھوں سے شرارت جھلکتی تھی۔ اس نے زبان کو لبوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"آؤ چلیں ــــ"

"کہاں ــــ" ؟

"بس یونہی سیر کرنے۔"

"لیکن میں اکیلا ہوں" اُس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

"تمھارا اور کوئی دوست نہیں ــــ" ؟ کٹی نے چمک کر کہا۔

اور اس کی جان میں جان آئی ۔ اس نے سُریندر کو آواز دی ، سُریندر آواز سُن کر پہچان گیا۔ کرسالا ایجنٹ ہوگا ۔ اور اس کو ایجنٹ سے نفرت تھی ۔ لیکن وہ ایجنٹ کی کار سے محبت کرتا تھا۔ وہ انڈرویر پہن کر فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ جلدی سے اُٹھ کر اس نے بالکونی سے نیچے دیکھا ۔ گوپال اس کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہا تھا ۔ اس نے وہیں کھڑے ہو کر کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا بات ہے ؟

ایک لڑکی نے سر نکالا اور اس کی طرف دیکھا۔

گوپال نے آنکھ ماری ۔ اور رعب دار لہجے میں کہا ــــ کپڑے پہن کر فوراً آؤ۔"

سُریندر نے ایک نئی ہیٹ نکالی ۔ بالوں میں تیل لگایا ۔ مانگ نکالی اور سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا ـــــ

گوپال نے کٹی اور ملٹی سے تعارف کرایا، سُریندر نے لڑکیوں کو دیکھا ہے اور اسے محسوس ہوا کہ ان لڑکیوں کو ضرور کہیں دیکھا ہے، شاید مدو سرکل کے قریب یہ ایک بار مُسکرائی تھیں۔ اس نے ایک بار لڑکیوں کا تعاقب کیا تھا۔ لیکن وہ لڑکیوں سے بات نہ کر سکا تھا۔ دونوں لڑکیاں اسے پسند تھیں۔ لیکن کٹی اسے زیادہ پسند تھی ـــــ

کٹی اُٹھ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی ۔ اور وہ ملٹی کے ساتھ بیٹھ گیا ۔ سریندر خوش شکل تھا۔ شاید اسی لئے لڑکیاں اس کی طرف جلدی مخاطب ہوئیں ۔ لڑکیاں باتیں کم کرتی تھیں ۔ مُسکراتی زیادہ تھیں ۔ اس نے اپنی فیلٹ ملٹی کے سر پر رکھ دی ۔

ملٹی نے کہا ـــــ "تھینک یو ـــــ" اور اس کی طرف دیکھ کر مُسکرانے لگی اور زبان لبوں پر پھیرنے لگی ۔ کٹی نے گوپال کو ہلکی سی چپت لگائی اور کار کو اسٹارٹ کرنے کے لئے کہا۔ گوپال نے سُریندر کو دیکھا ـــــ جیسے وہ پُوچھ رہا ہو ۔ کدھر چلیں ۔

"آپ کچھ کھائیں گی" ؟

دونوں نے سر ہلایا ۔ اور سُریندر نے گوپال کو کسی نزدیک کے ایرانی ہوٹل میں چلنے کے لئے کہا۔ گوپال نے کار اسٹارٹ کر دی اور چند منٹوں میں وہ ایک ایرانی کے ہوٹل میں داخل ہو کر ایک فیملی روم میں بیرے کو بُلا کر چائے اور آملیٹ کے لئے آرڈر دیا۔ اب کے سُریندر ملٹی کے قریب بیٹھ گیا ۔ اور گوپال کٹی کے قریب ۔ چاروں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے ۔ اب چاروں خاموش تھے ۔ چُپ چاپ تھے ۔ اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ۔

یہ خاموشی عجیب سی خاموشی تھی ۔ سُریندر نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے ملٹی سے کہا ۔

"آپ کے ہاتھ بہت ہی خوبصورت ہیں"

"آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کہیئے" ملی نے جل کر کہا۔"

گوپال کٹی کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ ایکایک اس کا ہاتھ کٹی کے گالوں سے چھوگیا۔"

Learn-manners کٹی نے گھورتے ہوئے گوپال سے کہا۔

گوپال کچھ کھسیانہ سا ہوگیا۔ اتنے میں بیرے نے چائے اور آملیٹ میز پر رکھ دیئے اور وہ سب کھانے لگے۔

سُریندر کا ہاتھ یکایک ملی کی سفید ٹانگوں سے جالگا اور ملی نے سُریندر کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا اور پھر آملیٹ کھانے لگی۔ گوپال نے اپنی کُرسی اور کٹی نے اپنی کُرسی اور دور کرلی۔ اور پھر مُسکرانے لگی۔ گوپال نے کُرسی قریب کرکے کٹی کے کمر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ کٹی نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ اس جھٹکے سے آملیٹ کی پلیٹ نیچے گرگئی۔ دونوں کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

کٹی نے قہر آلود نگاہوں سے گوپال اور سُریندر کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

میں سمجھتی تھی کہ آپ لوگ شریف ہوں گے۔ لیکن آپ تو بہت ہی بدتمیز ہیں۔"

گوپال اور سُریندر خاموش رہے۔

"اگر آپ ہمیں اسی طرح تنگ کریں گے تو ہم ابھی چلی جائیں گی۔"

اور وہ دونوں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ سریندر نے دونوں کی منت سماجت کی کہ اب دوبارہ کسی قسم کی حماقت نہ ہوگی۔ خدارا تُم دونوں بیٹھ جاؤ ____

اس منت سماجت کا اثر ضرور ہوا۔ اور وہ دونوں پھر چائے پینے لگیں۔

چائے پینے کے بعد وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکلے۔

دونوں اپنے کیے پر نادم تھے۔ لیکن جب چاروں سڑک پر آگئے۔ تو لوگ انھیں گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ گوپال اور سُریندر کو ایسا محسوس ہوا کہ سبھی لوگ انھیں خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ ان

کے ساتھ دو پارسی لڑکیاں ہیں اور وہ بھی کتنی خوبصورت ۔ اس احساس سے ان کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ اور وہ گزری ہوئی باتوں کو بھول کر کار میں بیٹھ گئے ۔

اس بار لمٹی گوپال کے ساتھ بیٹھی ۔ اور کٹی سُریندر کے ساتھ ۔ دراصل سُریندر خود کٹی کے ساتھ بیٹھنا چاہتا تھا کٹی کو وہ پسند کرتا تھا ۔ وہ لمٹی سے زیادہ باتیں کرتی تھی ۔ لمٹی سے زیادہ چالاک تھی ۔ اس کی مُسکراہٹ میں جاذبیت تھی اور جس انداز سے وہ دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے بیچ سے زبان نکالتی تھی وہ اسے بے حد پسند تھا ۔ دونوں کی شکلیں ایک دوسرے سے بہت ملتی جُلتی تھیں ۔ دونوں کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا ۔ کہ وہ ابھی نوعُمر ہیں ۔ ان کی شرارتیں ۔ ہنسی دبی دبی مُسکراہٹ اور کنکھیوں سے دیکھنا اکثر ان کی حرکتوں کو زیادہ جاذب نظر بناتا تھا ۔ گوپال نے کار کو پوری رفتار سے چھوڑ دیا ۔۔۔ اور سُریندر کٹی کے قریب سرک گیا ۔ اس کی ٹانگیں کٹی کی برہنہ ٹانگوں سے چھو رہی تھیں ۔ وہ ایک حسین خوبصورت لڑکی کی موجودگی کے احساس سے لطف اندوز ہو رہا تھا ۔ اور وہ لڑکی بھی اس کی جمالیاتی حُسن پر پُوری اُترتی تھی ۔ ہوا بھر اٹے بھرتی ہوئی گذر رہی تھی اور کٹی کے سیاہ بال ہواؤں میں لہرا رہے تھے ۔ گوپال لمٹی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا ۔ اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کیوں نہ کرتا ۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا ۔ جب کہ اسے ایک خوبصورت لڑکی کا قُرب حاصل ہوا تھا ۔ اور یہ لڑکیاں بھی کتنی فراخ دل تھیں ۔ ان کے ساتھ ریسٹورنٹ میں گئی تھیں ۔ انھوں نے خود سیر پر جانے کے لئے کہا تھا ۔ گو وہ خود شہر کے شور و غُل سے دور جانا چاہتے تھے ۔ اب وہ شہر سے دور جا رہے تھے ۔ مکانات پیچھے چھوٹ گئے تھے ۔ اور اب ایک سُرمئی سڑک نظر آ رہی تھی ۔ جس کے ساتھ سمندر کا گہرا نیلا پانی ٹکرا رہا تھا ۔ سڑک بالکل ویران دکھائی دیتی تھی ۔ گوپال نے کار کی رفتار کو کم کر دیا ۔ اب ایک چھوٹا سا میدان آ گیا جہاں پر ناریل کے درخت استادہ تھے ۔ گوپال نے کار کو ناریل کے درختوں کے قریب پارک کر دیا ۔

قریب ہی جھونپڑی سے دو عورتیں نکلیں ۔ اور ان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگیں ۔ جیسے کہہ رہی ہوں ۔ تُم کتنے خوش قسمت ہو ۔ تمھارے پاس ایک کار بھی ہے تمھارے

چہرے سے صاف عیاں ہے کہ تُم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہے ۔ اور اِدھر ہم ہیں کہ صرف ناریل کا پانی پیتے ہیں ۔ اور اُن گنت سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہیں ۔ اور زندگی بے جان اور بے کیف ہوتی جا رہی ہے ۔ اور تم لوگ ہماری بالکل پرواہ نہیں کرتے ۔"

گوپال اور سریندر نے ان عورتوں کو نظرانداز کر دیا ۔ کیوں کہ ان کے پہلو میں اتنی جاذب نظر چیزیں تھیں کہ وہ دوسری طرف دیکھنا گُناہ سمجھتے تھے ۔ سُریندر نے کٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ اور کہنے لگا :

"تمھاری قسمت بتاؤں ۔"؟

"ہاں بتاؤ ۔۔۔"

"تم زندگی میں کبھی شادی نہ کرو گی ۔"

کٹی نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگی ۔۔۔ "بس اور کچھ نہیں ۔"

" اور ہاں تمھارے دل کی لکیر یہ صاف بتاتی ہے کہ تم نہایت ہی اچھی لڑکی ہو لیکن ۔۔۔"

"لیکن کیا ۔۔۔"؟

"حالات کچھ ایسے ہیں ۔ کہ تمھیں اس قسم کی شرارتیں کرنی پڑتی ہیں ۔"

" اچھا یہ بتاؤ ۔ کہ میرے کتنے بچے ہوں گے ۔" کٹی نے دانتوں کے درمیان زبان ہلاتے ہوئے کہا ۔

" ایک بھی نہیں ۔"

" ہوں ۔۔۔"

"جی ۔"

" اور پھر تُم ایک شخص سے محبت کرو گی ۔ جو تم سے انتہائی محبت کرے گا ۔"

کٹی نے ایک ہلکی سی چپت اس کے مُنہ پر لگائی ۔۔۔ اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔

اب سریندر نے ملٹی کا ہاتھ دیکھنا شروع کیا ۔ " دیکھو تمھارے ہاتھ سے صاف ظاہر ہے

کہ تم باتیں کم کرتی ہو اور مُسکراتی زیادہ ہو۔ اور جو کچھ تمھارا دل کہتا ہے وہ تم نہیں کرتیں۔ بلکہ جو کچھ کٹی کہتی ہے وہ کرتی ہو تُم زندگی میں تین شادیاں کروگی۔ اور تمھارے گیارہ بچّے ہوں گے۔"

یہ سُن کر ملّی ہنس پڑی۔ اور کہنے لگی "شٹ اَپ۔"

گوپال نے ملّی کو ستانا شروع کیا لیکن ملّی نے اس سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس قسم کی حرکتیں نہ کرے۔ چند لمحوں تک ناریل کے درختوں کے قریب ٹہلتے رہے۔ سُورج دور سمندر میں ڈوب رہا تھا اور ان کی خونی کرنیں سمندر کو سُرخ کر رہی تھیں۔ ناریل کے درخت آکاش کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ہوا خوشی سے جھُومتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اور سُریندر کٹّی کے قریب سے اپنے آپ کو محظوظ کر رہا تھا۔ زندگی کتنی دلکش ہے۔ اس نے سوچا۔ اگر ایک حسین عورت پہلو میں ہو تو جی چاہتا ہے کہ زندگی اس کے پہلو میں بیٹھ کر گزار دی جائے۔ کچھ عرصے کے بعد کٹّی اس کے قریب سے اُٹھ کر گوپال کے پاس چلی گئی۔ سریندر سوچنے لگا کہ زندگی اتنی یاس انگیز نہیں، زندگی اتنی مصنوعی نہیں۔ اتنی بے کیف نہیں اور وہ ملّی کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ملّی کی آنکھوں میں معصومیت کی جھلک تھی۔ اس کے لبوں کے کونوں پر ایک دلفریب مُسکراہٹ ناچ رہی تھی، بالکل اسی طرح جس طرح سورج کی الوداعی کرنیں سمندر کی سطح پر ناچ رہی تھیں۔

اتنے میں گوپال نے سُریندر سے پُوچھا۔

"تمھارے پاس کچھ روپے ہیں"؟

"کون مانگتا ہے؟

"کٹّی"؟

"کتنے روپے"

"صرف دس روپے۔ وہ کہتی ہے کل واپس کردوں گی"

سُریندر نے دس روپے دیدیئے۔ اس کے پاس کُل پندرہ روپے تھے خیر کوئی بات نہیں اس نے سوچا۔ ابھی تک اس کی جیب میں پانچ روپے ہیں۔ اس کی نگاہوں میں لمحہ بھر کے

لئے مایوسی چھا گئی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے موسم بہار میں خزاں کا جھونکا آیا ہو۔ لیکن دوسرے لمحہ میں کٹی اس کے قریب کھڑی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی ۔

کم بخت لڑکی کتنی حسین ہے ۔ اس نے سوچا ۔

"دیکھو جی ۔ اب دیر ہو رہی ہے ۔ ڈیڈی میرا انتظار کر رہا ہوگا" "آج ماں ضرور پیٹے گی ۔"

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں ۔ اور چپکے سے کار میں بیٹھ گئیں ۔

کٹی نے سریندر کی فیلٹ لے لی ۔ اور اپنے سر پر رکھ لی ۔ اور کہنے لگی "میں کیسی دکھائی دیتی ہوں ۔"

"بہت ہی خوبصورت" سریندر نے مسکرا کر کہا ۔

اور وہ خوشی سے جھومنے لگی اور گوپال نے کار کی رفتار تیز کر دی ۔

سریندر نے اپنا ہاتھ کٹی کے زانوں پر رکھا ۔ ایک لمحہ ہاتھ وہاں رہا ۔ دوسرے لمحے میں کٹی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ۔ اور اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھنے لگی ۔ وہ گھبرا کر ایک طرف سرک گیا ۔

اب اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا ۔ سڑک پر بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے ۔ ہوا میں نمی اور ٹھنڈک زیادہ ہوتی جا رہی تھی ۔ اور فیکٹریوں کا دھواں گرد و پیش چھایا ہوا تھا ۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے ۔ کیا کہے ۔ نہ وہ آگے جا سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا ۔ یہ عجیب سی لڑکی ہے ۔ اس نے سوچا ۔ ہنستی ہے ۔ مسکراتی ہے ۔ دوسروں کے ساتھ اکیلی سیر کرنے جاتی ہے ۔ ہوٹل میں کھانا کھاتی ہے لیکن جسم کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتی اس کی نگاہوں میں شرارت ہے ۔ آنکھوں میں خمار ہے چال میں نزاکت ہے ۔ بالوں میں شباب کی خوشبو ہے ۔ کتنی پیاری ہے یہ لڑکی کتنا دلفریب ہے ۔ اس کا حسن ۔ کتنی تازگی اور لذت ہے اس کی آواز میں کتنی بے باکانہ ہے ۔ اس کی باتیں ۔

اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کار ایک جگہ پر آ کر رک گئی ۔

دونوں لڑکیاں کار سے اتر پڑیں ۔

"اب کب ملوگی۔؟
"جب کہو۔" کٹی نے فوراً جواب دیا۔"
"کل تین بجے کوئی فلم دیکھیں گے۔ اسی جگہ پر آنا۔"
دونوں نے سر ہلایا اور نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

اس رات سُریندر بالکل نہ سوسکا۔ وہ سونے کی کوشش کرتا لیکن کٹی کی دلکش تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی۔ کٹی کی ہنسی اس کی مسکراہٹ۔ اس کی باتیں بار بار اس کے کانوں سے ٹکراتیں۔ کٹی کے ملائم جسم پر لمس بار بار اس کے ذہن میں تھرکتا۔ وہ اکیلا سو رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ لیکن اس اندھیرے میں زندگی تھی۔ شباب تھا۔ ایک عجیب قسم کی خوشی کا احساس تھا۔ ایک لڑکی کے قرب نے اس کی سوئی ہوئی زندگی میں حرکت پیدا کردی تھی۔ لڑکی حسین نہ ہوتی تو شاید سریندر پچکے سے سوجاتا۔ لیکن لڑکی کی جسمانی دلکشی اور اس کا شوخ حُسن اسے رہ رہ کر یاد کرتا۔ کٹی کی شرارتیں۔ اس کی مُسکراہٹ۔ اس کی باتیں۔ اس کا مذاق۔ اس کی ہر حرکت اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار آرہی تھی۔ اور وہ بستر پر اکیلا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔ اگر وہ لڑکی اس کے پاس ہوتی۔ تو آج وہ کتنا خوش ہوتا۔ اس سے زیادہ خوش ہوتا۔ وہ خوشی۔ وہ لذت۔ وہ انبساط۔ وہ راحت جس سے وہ آج تک محروم تھا۔ اسے ضرور ملتی وہ اس لڑکی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ لڑکی اب اس کی ہو کر رہے گی۔ یہ لڑکی اب کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ اور اس کے ذہن میں بار بار یہ الفاظ گونجنے لگے" یہ لڑکی میری ہے۔ اگر دن بھر کی واردات میں اسے کسی بات کا افسوس تھا تو صرف دس روپوں کا اگر وہ امیر ہوتا تو دس روپے کیا۔ سو روپے تک دے دیتا۔ لیکن سُریندر کی آمدنی بہت قلیل تھی وہ جتنے روپے کماتا تھا اس سے صرف اس کے کھانے پینے یا مکان کے کرائے کا انتظام ہوسکتا تھا۔ اکثر مہینے کے آخر میں اُسے قرض لینا پڑتا تھا۔ یہ روپے جو اس کے پاس تھے اسے ہوٹل والے کو دینے تھے۔ اور یہاں کٹی تو اس سے دس روپے مانگ کر لے گئی ہے۔ وہ ضرور دس روپے واپس کردے گی۔ خیر اگر وہ واپس نہ بھی کرے۔ تب بھی کوئی بات

نہیں۔ دس روپوں کی حقیقت کیا ہے۔ وہ آج سے جی لگا کر محنت کرنے گا۔ خوب روپے کمائے گا۔ اور اگر کٹی نے اس سے روپے مانگے تو ضرور اسے اور روپے دے گا۔ وہ کٹی کو کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

جب صبح ہوئی تو اس نے نئے بلیڈ سے حجامت کی۔ ایک نیا سوٹ نکالا اور پہن کر گوپال کے گھر گیا۔ گوپال اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کیوں رات کیسی کٹی۔؟ گوپال نے پوچھا۔

"بالکل نیند نہیں آئی۔"

"اور تم۔؟

"سونے کی بہت کوشش کی مگر سو نہ سکا۔ لڑکیاں شریف گھرانے کی دکھائی دیتی ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"اب زندگی اچھی کٹ جائے گی۔"

"میاں لطف آجائے گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کل کتنا خرچ ہوا۔۔۔" ؟

"کُل بیس روپے خرچ ہوئے۔"

"وہ کیسے۔" ؟

"دس روپے کٹی کو دیئے۔ دس روپے ہوٹل والے کو۔۔۔ اور دس روپے کا خرچ ہوا۔ لیکن سُریندر مال خوب ہے۔ خُدا کی قسم اس سے بہتر لڑکی ساری بمبئی میں نہیں مل سکتی۔ دیکھو جب خُدا دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کٹی تمھاری ہے اور ملٹی میری ٹھیک ہے۔"

"سولہ آنے درست۔۔۔"

"اور آج کا کیا پروگرام ہے" ؟

"فلم دیکھیں گے۔"

سُریندر نے سر ہلایا۔

اور ہاں روپیوں کا انتظام کر لینا۔"

"کتنے روپیوں کا انتظام کروں؟"

"فلم دیکھیں گے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ خود ہی حساب لگا لو۔"

"دیکھو جی۔ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ آدھے پیسے تمھارے آدھے میرے۔"

"اب تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔

"اچھا میں نہا لوں۔"

اور اس طرح دوپہر ہو گئی۔ گوپال اور سریندر نے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اور خداداد سرکل پہنچ گئے۔

دونوں لڑکیاں وقت مقررہ پر پہنچ گئی تھیں۔ آج کٹی نے آسمانی رنگ کا فراک پہنا ہوا تھا۔ اور کم بخت ملٹی نے سیاہ رنگ کا فراک۔ سیاہ رنگ کا فراک اس کے سفید رنگ جسم پر خوب جچتا تھا۔ کٹی نے سریندر کو دیکھا۔ سریندر نے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں چپکے سے کار میں بیٹھ گئیں۔

"کہاں چلیں"؟

"جہاں تمھاری مرضی" کٹی نے کہا

"پکچر دیکھو گی"؟

کٹی نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

اور وہ سب ایک پکچر ہاؤس میں پہنچ گئے چار ٹکٹ خرید لئے گئے پکچر شروع ہونے سے پہلے وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کوئی دیکھ نہ لے۔" کٹی نے کہا۔

"کیا دیکھ لے گا۔"؟ سریندر نے کرخت لہجے میں کہا۔

"ارے یہ پارسی"

"تو پھر کیا ہوگا"؟

"گر انھوں نے ہمیں تمھارے ساتھ باتیں کرتے یا ہنستے ہنسلاتے دیکھ لیا تو ہمارا سوشل بائیکاٹ کریں گے ہمیں اجازت نہیں ہے کہ کسی غیر پارسی کے ساتھ گلچھرّے اُڑائیں۔

یہ سنتے ہی سریندر کچھ خاموش سا ہوگیا۔ جیسے چھاتی پر ایک سِل رکھ دی گئی ہو۔ یہ ہندو مُسلم کی تفریق پارسی غیر پارسی کی تفریق۔ یہ ہندو کرسچین کی تفریق یہ کالے اور گورے کی تفریق۔ یہ یہودی غیر یہودی کی تفریق۔ کس طرح انسانیت کا خاتمہ کر رہی ہے۔ ہر نسل میں ایک زہر بھر رہی ہے اور انسانوں کی زندگیوں کو تلخ سے تلخ تر بنا رہی ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پکچر شروع ہوگئی۔ دراصل وہ پکچر دیکھنے نہ آیا تھا وہ صرف کٹی سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی مُسکراہٹوں سے محفوظ ہونا چاہتا تھا۔ اس کی شرارتوں سے لُطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کٹی کو اپنی باہوں میں بھینچ لے۔ اس کے جسم کو سر سے لے کر پاؤں تک چومے اس کی سپید سپید رانوں کو ہاتھ پھیرے۔ وقت گزر رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔ وہ ہچکچا رہا تھا کہ کیا کرے۔ کس طرح کہے۔ کہ وہ اسے چھونے کے لئے بے قرار ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ چپکے سے اس کی ننگی ران پر رکھ دیا۔

کٹی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔۔۔

وہ ڈر گیا۔ کہیں کٹی اس سے ناراض نہ ہو جائے پھر وہ اس سے باتیں بھی نہ کر سکے گا۔

وہ خاموش ہوگیا۔ صرف ایک لمحے کے لئے ہاتھ پھر بڑھایا۔ کٹی نے اب کے ہاتھ پھر زور سے جھٹک دیا۔

وہ پھر خاموش ہوگیا۔

وقت گزر رہا تھا کہ پکچر جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ اندھیرا کب تک رہے ۔۔۔ یہ میٹھا گداز اندھیرا۔ وہ کیا کرے۔ وہ کس طرح اپنی سسکتی ہوئی روح کو تسکین دے۔ وہ کس طرح اس اندھی خواہش کی تکمیل کرے۔ وہ کس طرح اس جنونی کیفیت کو ٹھنڈا کرے۔ وہ سوچ رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں کچھ نہ آتا تھا۔

یکایک اسے شرارت سوجھی۔

"کٹی "؟

کٹی نے اس کی طرف دیکھا۔

"ذرا اِدھر جھکو۔"

وہ ذرا جھکی۔

"ذرا اور — میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

کٹی نے اپنا سر اس کے قریب اور جھکایا۔ اب کٹی کا چہرہ اس کے بالکل قریب تھا۔ اس نے چپکے سے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ اس کے گالوں پر رکھ دیئے۔

کٹی فوراً سرک گئی۔ اور زور کی چپت اس کے منہ پر ماری۔

سُریندر شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اسے اپنی اس بیہودہ حرکت پر بہت غصہ آیا۔ کٹی کوئی طوائف نہ تھی اس نے اس قسم کی حرکت کیوں کی۔ وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ اسے صرف ایک دوست سمجھ کر اس کے ساتھ آئی تھی۔ واقعی اسے بات کرنے کی تمیز نہ تھی۔ یہ کہاں کی شرافت تھی۔ یہ کہاں کی تہذیب ہے۔ کہ ایک لڑکی کے ساتھ آپ سینما دیکھنے کے لئے آئیں اور اس کی مرضی کے بغیر آپ اس کا منہ چوم لیں۔ یہ واقعی بیہودہ حرکت ہے۔ اسے اس قسم کی حرکت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ وہ رنجیدہ سا ہو گیا۔ اور ایک طرف کو سرک گیا۔

کٹی نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔"

"ناراض ہو گئے "؟

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"اچھا اپنا چہرہ اِدھر کرو۔"

"ذرا اور......"

اب کٹی کے گال اس کے بالکل قریب تھے۔ کٹی کا گرم سانس اس کے لبوں کو چوم رہا تھا۔ اس

نے زور سے ایک پھونک ماری اور مُسکرا پڑی اور کہنے لگی۔

"آئی لو یو۔"

"کیا تُم مجھ سے محبّت کرتے ہو" ؟

اور سُریندر نے سر ہلا دیا۔

"تب تُم مجھے چُوم سکتے ہو۔"

اور سُریندر نے اپنے تپتے ہوئے ہونٹ کٹی کے نرم اور گرم گالوں پر رکھ دیئے۔ اس بوسے نے اس کے جسم میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اُس کے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ کٹی اچھی لڑکی ہے اور اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ واقعی اس سے محبت کرتی ہے۔ سُریندر ہر شخص کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ لڑکی اس سے محبت کرتی ہے۔ کٹی واقعی اچھی لڑکی ہے۔ وہ اس سے پیار کرتی ہے۔ اب وہ دونوں اکٹھے رہیں گے۔ اگر اکٹھے نہ رہیں گے تو کم از کم ہر روز ملا کریں گے۔ کٹی صرف اچھی ہی نہیں۔ اچھی تو بہت سی لڑکیاں ہوتی ہیں وہ خوب صورت بھی ہے حسین بھی ہے۔ وہ باتیں کر سکتی ہے اور جب وہ دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے بیچ سے زبان کی نوک نکالتی ہے۔ تو اس وقت کتنی شوخ اور بے باک دکھائی دیتی ہے۔ آج وہ خوش تھا۔ اگر اس کے بس کی بات ہوتی۔ تو وہ کٹی کو ملکہ بنا دیتا۔ لیکن وہ خود قلاش تھا۔ وہ صرف محنت کر کے اپنا پیٹ پال سکتا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے دو گھنٹے گزر گئے۔ لیکن اس دوران میں سُریندر پکچر نہ دیکھ سکا۔ اس کی نگاہیں کٹی کی طرف تھیں۔ اس کے ہاتھ کٹی کی طرف بار بار جاتے وہ کٹی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا۔ اور دبانے لگتا۔ کبھی وہ کٹی کے بالوں کو چھیڑنے لگتا۔ کبھی وہ کٹی کے کانوں کو پیار سے کھینچتا۔ اور اسی نوک جھونک میں فلم ختم ہو گئی۔ وہ کار میں بیٹھ کر ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ گوپال کچھ رنجیدہ خاطر نظر آتا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ملّی کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ کار میں بیٹھ کر گوپال نے سُریندر کو بتایا کہ ملّی نے اسے ہاتھ تک نہیں لگانے دیا۔ ایک بار گوپال نے ملّی کو چومنے کی کوشش کی لیکن ملّی نے گوپال کی اس حرکت پر بہت بُرا بھلا کہا۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ لڑکیاں کس قسم کی ہیں۔ اور کیا چاہتی ہیں۔ کم بخت ہاتھ تک تو لگانے نہیں دیتیں۔ اور سُریندر نے دھیرے سے کہا۔

"میاں صبر کرو صبر۔"

اور پھر چاروں نے ہوٹل میں چائے پی اور ٹوسٹ کھائے۔ کٹی نے نہایت پیار سے سُریندر کو ٹوسٹ کھلائے وہ اس کی طرف دیکھ کر مُسکراتی رہی۔ کبھی کبھی اپنی چھوٹی سی پتلی زبان لبوں سے نکال کر سُریندر کو چڑاتی۔ کبھی چائے کا پیالہ چھین کر اسے چائے پلانے لگتی۔ اور کبھی کبھی یوں ہی ہنسنے لگتی۔ لمٹی اکثر خاموش رہتی۔ وہ کم باتیں کرتی۔ دراصل لمٹی پر کٹی کی شخصیت کا بہت اثر تھا لمٹی کو معلوم تھا کہ وہ کٹی سے زیادہ حسین نہیں ہے۔ زیادہ چالاک نہیں ہے۔ اگر لوگ لمٹی کو گوارا کرتے تھے۔ تو وہ محض کٹی کی وجہ سے لیکن گوپال لمٹی کو پاکر بھی خوش تھا۔ لمٹی اس کی طرف دیکھ کر مُسکراتی، ہنستی، لیکن اس ہنسی خوشی میں ایک طنز تھا۔ جیسے وہ گوپال کو پسند نہیں کرتی۔ جیسے وہ گوپال کو ——————

بدصُورت سمجھتی اور یہ بات گوپال کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ زندگی میں بہت سی ایسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں جو انسان برداشت کرنا نہیں چاہتا لیکن وقت کی ضرورت ان باتوں کو سہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ چائے پینے کے بعد وہ سب کار میں بیٹھ گئے۔ آج ہوٹل کا بل ضرورت سے زیادہ تھا۔ سُریندر کی رہی سہی پونجی ہوٹل کی نذر ہوگئی۔ اور اس کی جیب بالکل خالی ہوگئی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کچھ اداس سا ہوگیا۔

کٹی نے اس کے مُنہ پر ہلکی سی چپت لگائی "اور کہنے لگی "تُم کچھ اُداس نظر آتے ہو۔

"نہیں تو——"

"اب کِدھر کا اِرادہ ہے "؟

"تم کہاں جانا چاہتی ہو"؟

"ہم تو گھر جانا چاہتے ہیں۔ ڈیڈی اور ماما انتظار کر رہے ہوں گے۔

"ڈیڈی اور ماما" سُریندر نے یہ دو الفاظ پھر دُہرائے۔ ڈیڈی اور ماما۔ یہ دونوں عجیب ڈیڈی اور ماما ہیں ان کی لڑکیاں سرِبازار غیروں کے ساتھ پھرتی ہیں۔ گلچھرّے اُڑاتی ہیں۔ سیر کرتی ہیں۔ لیکن ان کی اماں ان سے کچھ نہیں کہتی۔ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں۔ خیر اسے ان

باتوں سے کیا تعلق ؟ -

اتنے میں گوپال اس کے قریب آیا۔ اور کہنے لگا ۔" کٹی روپے مانگتی ہے "

" روپے کیسے " ؟

" وہ مانگ رہی ہے "

" لیکن کس بات کے " ؟

" مجھے کیا معلوم ۔"

" میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ۔ جتنے روپے تھے ہوٹل والے کو دیدیئے ۔"

" اور جو میرے پاس تھے سینما میں خرچ ہو گئے۔ کم بخت عجیب لڑکی ہے ۔ مجھے تو ملی نے ہاتھ تک لگانے نہیں دیا ۔ اور اس چکر میں تقریباً ستر۔ اسی روپے خرچ ہو گئے ۔ مجھے تو کچھ ایسی ویسی لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔

کٹی پھر قریب آئی ۔ اور مسکرا کر گوپال سے روپے مانگنے لگی ۔

" روپے نہیں ہیں ۔" سُریندر نے جواب دیا ۔

" کیوں نہیں ہیں ۔" کٹی نے غصے میں آکر کہا ۔

" اس وقت روپے نہیں ہیں ۔ نہیں ہیں ۔ کل ضرور دیں گے "

" مجھے آج ہی ضرورت ہے ۔ اس وقت اگر خالی ہاتھ واپس جاؤں گی تو ڈیڈی کیا کہے گا ماما کیا کہے گی "

" اگر جیب میں روپے نہ ہوں تو کہاں سے لاکر دوں "

" تو پھر تم ہمیں یہاں لائے کیوں تھے ۔ ؟ "

" تم اپنی مرضی سے آئی تھیں ۔ ہم زبردستی پکڑ کر نہیں لائے تھے ۔" ؟

" زبردستی ۔" کٹی نے شر بار نگاہوں سے سُریندر کی طرف دیکھا اس کے چہرے کے نقوش خلط ملط ہو گئے تھے ۔ اس کے خوبصورت ہونٹ بالکل سکڑ گئے۔ چہرے کی ملائمیت جاتی رہی

آنکھوں کی شوخی، شرارت بالکل مفقود ہوگئی۔ اب وہ بالکل فارس روڈ کی رنڈی دکھائی دیتی تھی۔

"اگر روپے نہیں دو گے تو میں شور مچاؤں گی۔ میں اُن لوگوں کو بتاؤں گی۔ کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ بُرا کام کیا۔ اور اب یہ لوگ ہمیں روپے نہیں دیتے۔"

"روپے نہیں ہیں —" سُریندر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تمھیں دینے پڑیں گے۔" کٹی نے چیخ کر کہا۔"

"کس بات کے روپے؟ آخر کوئی وجہ بھی ہو۔"

"تم نے آج کا دن ضائع کیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ تُم غنڈے ہو۔" کٹی نے چمک کر کہا۔

غُنڈے کا لفظ سُنتے ہی۔ سریندر کا ہونٹ دانتوں کے نیچے آکر کٹ گیا۔ یکایک سُریندر کے دماغ میں خیال آیا۔ اگر اس لڑکی نے ایک لفظ اور نکالا۔ تو وہ اس کو جان سے مار دے گا۔ حرافہ کہیں کی...... اس لڑکی میں کتنا زہر ہے۔ ناگن کی طرح ڈنک مارتی ہے۔

سُریندر کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ کٹی موقع کی نزاکت کو بھانپ گئی اور گالیاں بکتی ہوئی آگے نکل گئی۔

*

کٹی کے چلے جانے کے بعد سُریندر کو احساس ہوا۔ کہ اس کے ہرے بھرے کھیت میں آگ لگ گئی نیا نیا محل آن واحد میں گر پڑا لیکن سریندر کا خون کھول رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا وہ کٹی کے روپے کا جواز چاہتا تھا۔ کٹی نے اس طرح کیوں "BEHAVE —" کیا وہ کٹی کی اس شخصیت سے بالکل بے خبر تھا وہ کبھی خیال بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہ لڑکی اتنی بے غیرت ہو سکتی ہے۔ گُلاب کی کلی میں اتنا زہر ہو سکتا ہے۔ وہ اب تک صرف اس کٹی کو جانتا تھا۔ جو ہنستی تھی مُسکراتی تھی خوبصورت تھی جس کے ریشمی بال تھے۔ جس کا جسم متناسب تھا جس کی آنکھوں میں شرارت تھی جس کی چال میں شباب تھا۔ جس کی آواز میں شہد جیسی مٹھاس تھی۔ لیکن آج کی کٹی بالکل مختلف تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک فارس روڈ کی رنڈی ہے۔ اس کی باتوں میں زہر تھا۔ بچھو کا ڈنک تھا۔ آنکھوں سے وحشت ٹپکتی تھی

اس کے لب اکڑ گئے تھے ۔ چہرے پر کرختگی کے آثار تھے اس شہد میں کتنی کڑواہٹ تھی ۔ اس حُسن میں کتنی گندگی تھی اُس آواز میں کتنی تلخی تھی ۔ اس جسم میں کتنی بو تھی ۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا ۔ وہ کیوں آن واحد میں بدل گئی اور اس سے پہلے جو کچھ کٹی نے کہا تھا ۔ ایک سلیقہ تھا ۔ ایک ترتیب تھی ۔ ایک تسلسل تھا ۔

اتنے میں کار گھر کے قریب رُکی ۔

بہت ہی چالاک تھیں یہ لڑکیاں ۔ گوپال نے شکست خوردہ آواز میں کہا ۔

" مجھے تو اس قسم کے سلوک کی ہرگز توقع نہ تھی ۔ سُریندر نے سر کو نیچا کر کے کہا ۔

" بھائی سچ بات تو یہ ہے کہ میں تو ان سے ملنے سے رہا ۔ ایک تو روپے ضائع کروں اور پھر گالیاں کھاؤں ۔ آج سے میں ان کے ساتھ گھومنے نہیں جاؤں گا ۔ اچھا خُدا حافظ "

سُریندر نے ہیٹ اُٹھایا اور چل دیا ۔

❖

سُریندر رات بھر نہ سو سکا ۔ اسے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ دوبارہ اُن سے کبھی نہ ملے ۔ واقعی ان لڑکیوں سے کبھی نہیں ملنا چاہیئے ۔ ان لڑکیوں نے اس کی بے عزتی کی ہے ۔ اس کے مُنہ پر تھوکا ہے ۔ اسے اُلو بنانے کی کوشش کی ہے ۔ بلکہ اُلو بنایا ہے ۔ اسے اُن لڑکیوں سے کبھی نہیں ملنا چاہیئے ۔ لیکن دل کے دوسرے کونے سے ایک اور ہی آواز آ رہی تھی ایک اور ہی تصویر اُبھر رہی تھی ۔ اُس کے نقوش سُریندر کے دل کی سطح پر بہت گہرے پڑ گئے تھے ۔ وہ نقش تھے کٹی کے ۔ اس خوبصورت لڑکی کے جو اس کی طرف دیکھ کر مُسکراتی تھی ۔ جس نے اس کے گالوں کو ہلکی سی چپت لگائی تھی ۔ جس نے سینما ہال میں بیٹھ کر کہا تھا "

آئی لو یو ـــــ جو اکثر چھوٹی سی پتلی زبان دانتوں کے درمیان سے نکال کر اسے چڑاتی تھی یہ تصویر رہ رہ کر اسے یاد دلاتی تھی سُریندر جذباتی تھا ۔ گوپال سے زیادہ ذہین اور حساس تھا ۔ شاید اسے عورت کے قرب کی زیادہ ضرورت تھی ۔ شاید اسے کٹی سے عشق ہو گیا تھا ۔ عشق ـــــ وہ ہنسنے لگا ۔ جی ہاں ۔ کتنا فرسودہ لفظ ہے ۔ اب تو بالکل بے جان ہو کر رہ گیا ہے اس مشینی دور میں عشق کرنا مذاق اُڑانا ہے ۔

نہیں بھائی عشق نہیں تھا۔ بلکہ وہ لڑکی کا جسم چاہتا تھا۔ عجیب سی بات ہے۔ نہایت صاف سی بات ہے۔ جی ہاں سریندر کو کٹی سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کٹی کے قریب رہے اس سے باتیں کرے اس سے مذاق کرے اور وہ مذاق کرتی رہے اور کہتی رہے آئی لو یو ــــ آئی لو یو ــــ آئی لو یو ــــ نہیں وہ کٹی کو نہیں جانے دے گا وہ اسے اوجھل نہیں ہونے دے گا۔ کٹی اس کی روح ہے۔ اس کی خوشی ہے وہ کٹی کو پکڑ سکتا ہے۔ اُسے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ لیکن کس طرح ــــ اس نے سوچنا چاہا ــــ اور بار بار یہی جواب ملا۔ کہ وہ قلاش ہے۔ غریب ہے۔ وہ ہر روز بیس یا تیس روپے کٹی پر خرچ نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ کٹی کو چاہتا ہے۔ وہ روپے ضرور حاصل کرے گا۔ وہ لوگوں سے مانگے گا۔ دوستوں کے آگے ہاتھ پھیلائے گا۔ وہ دن رات کام کرے گا۔ وہ ہر مالدار آدمی کے آگے ناک رگڑے گا۔ اور اگر کہیں سے روپے نہ کما سکا تو وہ چوری کرے گا۔ ڈاکہ ڈالے گا ــــ لیکن کٹی کو ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ نہیں جانے دے گا۔

٭

جب صبح اٹھا ــــ تو دل کا غبار کچھ ہلکا پڑ گیا تھا۔ عشق کی جگہ کچھ خودداری نے لے لی تھی۔ اور اس کے دل میں یہ خیال آ رہا تھا۔ کہ اُسے دوبارہ کٹی سے نہیں ملنا چاہئے۔ اور وہ مل بھی نہیں سکتا اس کے پاس روپے نہیں ہیں وہ چوری نہیں کرے گا لیکن وہ دوستوں سے روپے ضرور مانگے گا۔ وہ زیادہ کام کر سکتا ہے۔ اور اس طرح وہ کافی روپے کما سکے گا۔ لیکن اب کٹی اس سے بات نہیں کرے گی۔ بھلا وہ کیوں اس سے ملے گی۔ وہ اس سے بالکل ناراض ہو گئی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے وہ خداداد سرکل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس دن وہ خداداد سرکل میں نہ آئیں۔ وہ ہر روز اس سرکل کے قریب جاتا۔ لیکن مایوس واپس لوٹتا ــــ کمرے میں بیٹھ کر اپنے آپ کو کوسنے لگتا۔ اور خاص کر اس ماحول کو جس میں وہ رہتا تھا۔ کاش اس کے پاس روپے ہوتے ــــ یا کوئی ایسا کام کر سکتا۔ جس سے اس کے جیب میں سو سو کے نوٹ ہوتے۔ وہ نوٹ لے کر کٹی کے پاس جاتا اور اس کے مُنہ پہ مارتا اور کہتا ــــ ،،یہ لو نوٹ۔

اگر تمھیں ان سے محبت ہے تو یہ لو ـــ ایک نہیں دس نوٹ ۔ دس نہیں سوسو کے نوٹ ۔ ان کو لے جاؤ اور اپنے ڈیڈی اور ممی کو دو ۔ اور اس کے بعد کبھی مجھ سے نہ ملنا ۔" یہ سوچتے سوچتے اسے اپنے آپ پر غصہ آجاتا ۔ اس سسٹم پر غصہ آجاتا ۔ اس زندگی پر غصہ آجاتا ۔ ان نامراد لڑکیوں پر غصہ آجاتا ۔ اور اس طرح وہ اپنی زندگی میں زہر بھرتا رہا ۔ آخر وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا ۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو گالی بھی دینے لگتا ۔ اسے کمبخت تو کٹی کو دس روپے نہ دے سکا ۔ شاید اس کے ڈیڈی ماما کو ضرورت ہو ۔ اگر وہ کسی دوست سے مانگ کر اسے روپے دیدیتا ۔ تو کٹی اس سے کبھی ناراض نہ ہوتی ۔ خیر کوئی بات نہیں وہ ضرور اسے منائے گا ۔ اور اسے روپے دے گا ۔ اور بہت سے روپے دے گا ۔

ایک دن کٹی اُسے خداداد سرکل میں مل گئی ۔

کٹی نے اس کی طرف دیکھا ۔

سُریندر نے کٹی کو دیکھا ۔

کٹی مُسکرا پڑی ۔ اور اس نے اپنی زبان دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے درمیان سے نکالی اور پھر کھکھلا کر ہنس پڑی ۔

"ہیلو ـــ"

"ہیلو ـــ"

کٹی ۔ ملٹی اور وہ ایک ہوٹل میں چلے گئے ۔ اس دوران میں وہ گزری ہوئی باتیں بھول گئے ۔ اب زندگی پھر خوشگوار ہو رہی تھی ۔ اب پھر اس زندگی میں آگ تھی ۔ لبوں پر پھر مُسکراہٹ تھی ۔ وہ تینوں پھر گرم چائے پی رہے تھے ۔ اور زندگی خوشگوار ہو رہی تھی ۔ ملٹی نے گوپال کے متعلق پُوچھا ۔ اور سُریندر نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ کئی دنوں سے گوپال سے نہیں ملا ۔

سُریندر نے ہوٹل کا بل ادا کیا ـــ اور ملٹی نے اس سے پکچر دکھانے کے لئے کہا ۔

اور وہ مان گیا ـــ

پکچر شروع ہوگئی ۔

کٹی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کٹی جس کی تلاش میں نیند حرام ہو چکی تھی۔ جس کی یاد میں وہ اکثر رو چکا تھا۔ جس کو پانے کے لئے وہ چوری تک کرنے کو تیار تھا۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو تیار تھا۔ جس کے لئے وہ مالدار آدمیوں کے سامنے اپنا دامن تک بیچنے کے لئے تیار تھا۔ وہ آج اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ کٹی نے فراک پہنا ہوا تھا۔ کٹی اسی طرح ہنس رہی تھی، کھیل رہی تھی مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کو دبا رہی تھی۔ اس کا گرم سانس اس کے گالوں سے مس ہو رہا تھا۔ وہ خوش تھا۔ آج وہ بیحد خوش تھا۔ ایک عرصہ کے بعد کٹی اسے مل گئی تھی۔ وہ کٹی کو پالے گا۔ وہ کٹی سے شادی کرے گا۔ وہ کٹی کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ کٹی صرف اس کی ہے۔ صرف اس کی ہے۔ وہ کٹی کو بہت روپے دے گا وہ دن رات محنت کرے گا۔ کٹی خوبصورت ہے۔ بہت ہی خوبصورت ہے۔ کٹی جوان ہے۔ بہت ہی جوان ہے۔ وہ کٹی کو راہِ راست پر لے آئے گا۔ اگر کٹی میں کچھ خامیاں ہیں تو وہ انھیں دور کرنے میں کٹی کی مدد کرے گا۔ کٹی کو آج تک کوئی اچھا انسان نہیں ملا۔ اُسے شریفوں کی محفل میں بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے اس کی شخصیت دو حصّوں میں بٹ گئی ہے۔ اسی لئے اس کی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اگر ایک رُخ اچھا ہے تو دوسرا بہت ہی بُرا ہے۔ اگر ایک سے پیار ہے۔ تو دوسرے سے نفرت۔ وہ اچھے رُخ کو اُبھارے گا۔ وہ کٹی کی زندگی کو بہتر بنائے گا۔ وہ کٹی کو بتائے گا کہ تمھاری ایک اچھی شخصیت بھی ہے۔ اس شخصیت سے کٹی بیگانہ ہے۔ اسے شخصیت کا کچھ علم نہیں۔ خیر اسے اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ کٹی کا ہاتھ اس کے سینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ کیا چاہتی ہے۔

کٹی کا ہاتھ سُریندر کے کوٹ کی اندرونی جیب میں چلا گیا۔

کٹی نے اس کا بٹوہ نکال لیا۔

وہ خاموش رہا۔

کٹی نے بٹوہ میں سے روپے نکال لئے۔

اور وہ خاموش ہوگیا۔

کٹی نے سب نوٹ اپنی جیب میں رکھ لئے۔

وہ بالکل خاموش ہوگیا۔

کٹی نے چینج بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

کٹی نے خالی بٹوہ اس کی جیب میں رکھ دیا۔

اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ پکچر ختم ہوگئی اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔
کٹی نے اجازت مانگی اور اس نے سر ہلا دیا۔ اور وہ دونوں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں۔

❖

اس کے بٹوے میں تین روپے اور کچھ آنے تھے۔ وہ سب کٹی نے نکال لئے۔ اس کے پاس بس کے لئے کرایہ بھی نہ تھا اور وہ سڑک پر پیدل چلتا رہا۔ اس کے قریب سے لوگ گزر رہے تھے۔ لیکن اسے کسی کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔ وہ صرف آج کے حادثہ پر غور کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچھی بھلی لڑکیاں آن واحد میں کس طرح طوائف کا روپ دھارن کر لیتی ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اور لوگ چلے جا رہے تھے۔ آگے بڑھ رہے تھے۔ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا لیکن زندگی افسردہ اور بے کیف ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اور کٹی دور جا چکی تھی۔ اور سوچ رہا تھا۔ اور یکایک اسے محسوس ہوا کہ وہ کٹی جس سے اُسے محبت تھی مر چکی ہے۔ صرف ایک طوائف اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اپنے جسم کی قیمت مانگ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ آگے بڑھتا گیا۔

ڈیڑھ روپیہ

جس عمارت کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ظاہری طور پر بڑی باوقار، سنجیدہ اور بارعب دکھائی دیتی ہے لیکن اندر سے بڑی گندی اور غلیظ ہے۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے اس لیے میں اس کے حدود اربعہ سے اچھی طرح واقف ہوں گراؤنڈ فلور میں دن کو بھی اندھیرا رہتا ہے۔ یہاں سورج کبھی نہیں چڑھتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک مسلسل رات ہے۔ جو دن رات چھائی رہتی ہے۔

گراؤنڈ فلور کو مختلف کمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کمروں کے باہر غلاظت کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور لوگ ان کی غلاظت کے قریب چارپائیاں بچھا کر سوتے ہیں۔ کوئی دن کو سوتا ہے اور رات بھر کام کرتا ہے اور کوئی رات بھر سوتا ہے۔ اور دن بھر کام کرتا ہے۔ بہرحال چارپائیاں اپنی جگہ پر بچھی رہتی ہیں اور لوگ مزے سے اُن پر سوتے ہیں اور خرّاٹے لیتے ہیں۔ گراؤنڈ فلور میں رہنے والوں کی اکثریت نچلے طبقے کی ہے۔ اور مجھے اس قسم کے لوگوں سے سخت نفرت ہے اپنے خاصے کشادہ کمروں کو انھوں نے گندی چالوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایک ایک کمرے میں تین تین خاندان رہتے ہیں۔ یہ وہیں سوتے ہیں روتے ہیں ہنستے ہیں۔ شادیاں کرتے ہیں اور پھر ہر سال بچوں کی تعداد میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ یہ بچے ننگ دھڑنگ اپنے کمروں کے دروازوں سے باہر عین سڑک کے بیچ دن بھر کھیلتے ہیں اور آنے جانے والی موٹروں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان کی ایک آدھ ٹانگ یا ہاتھ کچل

دیں تاکہ باقی عُمر بھی چین اور آرام سے نہ کٹ سکے۔

میں اس عمارت کے پہلے فلور پر رہتا ہوں۔ یہ فلور گراؤنڈ سے کافی صاف سُتھرا ہے۔ ایک کمرے میں صرف ایک پریوار رہتا ہے عورتیں مرد اور بچے مقابلتہً صاف اور اُجلے کپڑے پہنتے ہیں اندر کی دیواریں کافی ستھری ہیں اور پلستر سے کافی آراستہ نظر آتی ہیں۔ لیکن کمروں کے باہر کی دیواریں کافی گندی اور غلیظ ہیں لوگ اپنے اپنے کمروں میں سوتے ہیں۔ دن کو بھی رات کو بھی۔

دوسرے فلور کے لوگ پہلے فلور۔ اور گروند فلور کے رہنے والوں سے زیادہ خوشحال اور رفارغ البال نظر آتے ہیں۔ گو کمروں کی لمبائی چوڑائی میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن صفائی اور رکھ رکھاؤ اور رہنے سہنے کے طریقوں نے انھیں الگ حیثیت بخش دی ہے۔ سکنڈر فلور کلاس میں رہنے والوں کی لڑکیاں اسکول اور کالجوں میں پڑھتی ہیں۔ بھڑکیلی ساڑیاں اور رنگین فراک پہنتی ہیں۔ چہروں پر شگفتگی اور شادابی ہے اور کافی سمارٹ اور صحت مند نظر آتی ہیں بلڈنگ کے پھیلے ہوئے اندھیرے میں اجالے کا کام دیتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ مجھے افلاس کے مارے ہوئے لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ ان کے ساتھ رہ کر بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ میرے دوست رام دیال جو مزدوروں کے لیڈر ہیں اور انقلابی بھی ہیں وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ مزدوروں کی اگوائی میں ایک نیا ہندستان جنم لے گا۔ میں اس گرونڈ فلور کے رہنے والوں کی طرف اشارہ کر کے بتانے کی کوشش کرتا ہوں کہ بھئی یہ ترے نیتا ہیں پہلے ان کی طرف دیکھ لو۔ پھر انقلاب کی بات کرنا۔ وہ اکثر میری بات سُن کر ہنس دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں میاں تُم بورژوا ہو بورژوا تمھارے دل میں عام آدمیوں کے لئے نفرت کے سوا کچھ نہیں۔" دراصل یہ نفرت میرے دل میں یوں ہی جاگزیں نہ ہوئی تھی اس کی بنیاد بڑی پکی اور پائیدار ہے میں قصے کو لمبا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ایک نوکر کو بچپن سے لے کر جوانی تک پالا۔ اور ایک دن میں نے اسے ڈھائی سو روپے کا چیک کیش کرانے کے لئے بینک میں بھیجا مگر اس دن کے بعد سے وہ کبھی واپس نہ آیا۔ میں اس سے صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ بھئی میں نے تم سے کیا بدسلوکی کی تھی جس کے عوض تم نے مجھے یہ سزا دی تم نے

میری شرافت اور انسانیت کا یہی صلہ دیا ؟

اس نوکر کے رفوچکر ہونے کے بعد میں نے ایک اور بچے کو نوکر رکھا جس کی عمر آٹھ سال سے زائد نہ تھی۔ چھ سال رہنے کے بعد اب اس نے اپنی خاصی صحت بنالی۔ تو ایک دن مجھ سے کہنے لگا میں آپ کی نوکری نہیں کروں گا۔ آج بی بی جی نے میری بے عزتی کی ہے۔ میں بازار جاکر چوڑیوں کا دھندہ کرلوں گا۔ محنت مزدوری کرلوں گا۔ دیسی شراب کا بیوپار کرلوں گا لیکن آپ کی نوکری نہیں کرونگا۔ یہ کہہ کر وہ میرے گھر سے باہر نکل گیا۔

ویسے بھی مجھے غریب، مفلوک الحال اور تلاش آدمیوں سے ایک چڑ سی ہے۔ جب کوئی انسان میرے پاس آکے چند روپوں کے لئے گڑگڑاتا ہے۔ اور اپنی بھوک بے بسی و بے روزگاری کا رونا روتا ہے تو مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ میں اسے اس حالت میں دیکھ کر کتنا خوش ہوتا ہوں اس کا آپ اندازہ نہیں کرسکتے دل ہی دل میں کہتا ہوں۔ اور انقلاب لاؤ۔ یہ لوگ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہی رہیں گے تو اچھی بات ہے۔

اس بلڈنگ میں بڑے دلچسپ لوگ آتے ہیں۔ ایک صاحب مہینے میں صرف ایک بار آتے ہیں وہ مالک مکان کے منشی ہیں اور کرایہ داروں سے صرف کرایہ وصول کرتے ہیں۔ آتے ہی کنڈی اس زور سے کھٹ کھٹائیں گے جیسے کہیں آگ لگ گئی ہو۔ کچھ بھی کیجئے کرایہ وصول کئے بغیر واپس جائیں گے۔

اس منشی کے علاوہ اس عمارت میں بھنگی کا کام دو نوجوان چھوکرے کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی بوڑھی ماں بھی آتی۔ دونوں لڑکے تقریباً ہر روز مجھ سے ایک یا دو آنے چائے پینے کے لئے مانگ کر لے جاتے۔ وہ نہایت ہی مسکین صورت بنائے ہوئے میرے سامنے آتے جھجک اور شرم سے لبادے کو اوڑھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے یہ بچے ہمیشہ ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے سے رہتے ہیں ان کے پھٹے ہوئے کپڑوں اور ان کے میلے اور گندے چہروں۔ اور ان کے ننگے پاؤں کو دیکھ کر حقارت سے منہ موڑ لیتا۔ ان کی میلی کچیلی ہتھیلیوں پر جو متواتر جھاڑو دینے سے کافی کھُردری ہوگئیں تھیں۔ از راہِ کرم ایک دو آنے رکھدیتا۔ ان لوگوں کا یہی حشر ہونا چاہیے۔

میں زیرِ لب کہتا۔

دراصل میں ان لوگوں میں سے ہوں ۔ جو دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے ہیں میں خود ایک پُرسکون، خوش حال زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں لیکن دوسروں کو محنت مزدوری کرتے دیکھ کر مجھے بیحد مسرت ہوتی ہے، میں ہمیشہ یہ چاہتا ہوں کہ یہ لوگ میرے دست نگر رہیں ۔ یہ لوگ میرے آگے ہاتھ پھیلائیں ۔ گڑگڑائیں ۔ ناک رگڑیں اپنے غم والم کا قصہ سُنائیں اور میں اُن پر ترس کھا کر ان کی مدد کرتا رہوں ۔

کچھ دن اسی طرح گزر گئے ۔ ایک دن یہ معلوم ہوا کہ ان دو بھنگیوں کی جگہ ایک نیا بھنگی مامور کیا گیا ہے دراصل بھنگی اور سفیر کبھی ایک جگہ نہیں رہتے ۔ اکثر اپنی جگہیں بدلتے رہتے ہیں ابھی تک میں نے اس نئے بھنگی کو نہیں دیکھا تھا ایک دن میرا بھی اس نئے بھنگی سے آمنا سامنا ہو گیا ۔ وہ واقعی عجوبہ تھا ۔ گو اس کا قد لامبا اور رنگ کالی مٹی کی طرح سیاہ تھا ۔ جسم دُبلا پتلا ۔ متفکر چہرہ جیسے کسی معلم کا ہوتا ہے ۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں ۔ پلکیں آپس میں چپکی ہوئیں اور چہرے پر ایک عجیب وحشت طاری تھی اس ملاقات کے بعد جب کبھی میں نے اسے دیکھا ہمیشہ کام کرتے ہوئے نظر آیا ۔ یہ واقعی حیرت کا مقام تھا ۔ بھنگی اور اپنے کام کا اتنا پابند اور پھر اتنا سنجیدہ ۔ ایک دن اچانک میری نگاہ اس کے پاؤں پر چلی گئی ۔

بڑے بھدے اور بے ڈھنگے پاؤں تھے پاؤں کا انگوٹھا راس کماری کی طرح آگے بڑھا ہوا تھا ۔ باقی اُنگلیاں بھی ٹیڑھی میڑھی ۔ اتنے لمبے اور بے ڈول پاؤں میں نے اپنی عمر میں بہت کم دیکھے تھے جو لوگ جسمانی محنت زیادہ کرتے ہیں ان کے ہاتھ اور پاؤں اکثر بے ڈول اور بے ڈھنگے ہوتے ہیں ۔ انسان تو ان سے انتقام لیتا ہی ہے مگر قدرت بھی ان سے انتقام لینے میں باز نہیں آتی ۔

پہلی ہی ملاقات میں مجھے اس بھنگی سے نفرت سی ہو گئی ۔ ویسے عام آدمیوں سے نفرت میرا ذاتی مشغلہ ہے اور یہی نفرت میری اَنا کو اُبھارتی ہے ۔ میرے لئے بھنگی کا توہین آمیز رویہ ناقابل برداشت تھا یعنی جب کبھی میں اس کے پاس سے گذرتا وہ میری طرف آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھتا ۔ نہ کبھی سلام کرتا ۔ نہ نگاہ سے نگاہ ملاتا ۔ نہ آداب بجالاتا ۔ عجیب چُغد ہے ۔ تعظیم و تکریم جس پر میرا آبائی حق ہے ۔ اسے بھی نظر انداز کر رہا ہے ۔ میری

باوقار شخصیت سے بالکل بیگانہ تھا۔ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ دو کوڑی کا بھنگی اور اکڑفوں۔ اتنی ۔

سچ ہے نیچ ذات کے لوگوں کو سر پر نہیں چڑھانا چاہئے۔ خیر۔ غریب انسان ہے ۔ کہاں جائے گا ۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ کبھی کبھی یہ میرے آگے ہاتھ پھیلائے گا جب گھر میں بھوک بڑھے گی تب لیکن صاحب اسے کام کرتے ہوئے ایک سال گزر گیا۔ ہولی آئی وہ بھنگی میرے پاس نہ آیا۔ پھر عید آئی جب بھی وہ بھنگی میرے قریب نہ آیا۔ اور اسی طرح دسہرہ ۔ دیوالی ۔ کرسمس آئی اور چلی گئی۔ لیکن اس دو ٹکے کے بھنگی نے میرے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلائے۔ میرے ہی آگے کیا ۔ بلڈنگ کے کسی آدمی کے آگے اس نے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ ایسا سر پھرا بھنگی میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ضرور کوئی انقلابی ہوگا۔ میں نے سوچا۔

اس کی بے جا اکڑفوں خودسری ۔ خود اعتمادی ۔ اور نامعقول اَنا کو دیکھ کر میں آپے سے باہر ہوگیا۔ میں اَنا کو صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہوں ۔ دوسروں کی انا کو نظر انداز کرنا۔ میں نے کافی غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کچھ دیر اور انتظار کیا جائے ۔ شکار اگر خود جال میں پھنس جائے تبھی لطف ہے ۔ ویسے غریب اور مفلس لوگوں سے ٹکر لینے سے کیا فائدہ ؟

بڑوں کا مقولہ ہے کہ ہمیشہ ان سے ٹکراؤ جو اپنے سے بڑے ہوں ۔ میں نے سوچا خود کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔ مجھ سے بچ کر شاید چلا جائے لیکن اس زندگی کی بیہودگیوں شکستوں اور ناکامیوں سے بچ کر کہاں جائے گا ؟

اور وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میرے کمرے کے ساتھ والا غسل خانہ کافی گندا ہوگیا۔ گندا تو پہلے ہی تھا۔ لیکن اب زیادہ گندا ہوگیا ۔ یہ غسل خانہ بھی کیا تھا ۔ بیک وقت برتن مانجھنے، کپڑے دھونے نہانے اور گانے کا کام اس غسل خانے سے لیا جاتا تا برتنوں کی ساری اور صبح و شام کی بچی ہوئی غلاظت اس موری میں ڈالی جاتی ۔ آہستہ آہستہ اس کا پائپ راکھ سے بھرنے لگا ۔ پھر ایک دن سارا غسل خانہ پانی سے بھر گیا۔ کیونکہ موری مٹی اور راکھ سے لبالب بھر گئی ۔ اور اب پانی کے نکاس کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔

جب اس مسئلے پر پہلے فلور کے رہنے والوں نے بحث کی ۔ تو پتہ چلا کہ موری کے اوپر کی چھلنی غائب ہے ۔ اگر بازار سے چھلنی خرید کر فوری طور پر لگادی جائے تو پائپ میں مٹی نہ بھرے گی ۔ اور اس

طرح غسل خانہ صاف اور ستھرا رہے گا۔

اس گھٹیا کام کو کون کرے ؟ گھٹیا کام کو گھٹیا آدمی ہی کر سکتا ہے ۔ ہم تو بڑے آدمی ٹھہرے ۔ اس لئے میں اس بھنگی کی طرف رجوع ہوا۔ اگلے دن میں نے بھنگی سے کہا۔" جس کے نام سے میں آج تک ناواقف تھا اور نہ جانے کی کبھی کوشش کی ۔صرف بھنگی پکار کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا ۔میں نے کہا۔ اے ذرا اس پائپ میں سے مٹی نکال دے تاکہ غسل خانہ مٹی سے نہ بھرے"

اس نے بڑی لاپرواہی سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا" ساری بلڈنگ کے برتن اس غسل خانہ میں صاف کئے جاتے ہیں ۔یہ غسل خانہ پانی سے نہ بھرے تو کیا ہو۔ جب تک چھنی نہ آئے گی۔ غسل خانہ صاف نہ ہو سکے گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر جھاڑو دینے لگا۔

"چھنی کون لائے گا۔" میں نے بارعب لہجے میں کہا ۔

" آپ پیسے دے دیجئے میں چور بازار سے لادوں گا۔" اس نے میری طرف لاپرواہی سے کہا ہوئے کہا۔

"کتنے روپے"

" ڈیڑھ روپیہ"

میں نے فوراً ڈیڑھ روپیہ اپنی قمیض کی جیب سے نکالا اور اس کی سیاہ اور کھردری ہتھیلی پر رکھ دیا۔

تین دن اور گزر گئے چھنی نہ آئی ۔

چوتھے دن میں نے بھنگی سے پوچھا کہ "چھنی کیوں نہیں لائے ۔

" کل لاؤں گا آج بھول گیا ۔" اس کی آنکھیں ندامت سے جھک گئیں ۔اور میری طرف نہ دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا مگر بھنگی چھنی نہیں لایا ۔ اب یہ بھنگی صبح ہی آتا۔ اور میرے جاگنے سے پہلے غسل خانہ اور باقی جگہ کو صاف کر کے چلا جاتا ۔ اس کی حرکتوں سے صاف عیاں تھا کہ

بھنگی میرا ڈیڑھ روپیہ ہضم کرگیا ۔ لاشعور میں جو تھوڑی بہت خفیہ عقیدت مجھے نچلے طبقے سے تھی۔ وہ بھی جاتی رہی ۔ دراصل بھنگی کی اس لغزش پر میں خوش ضرور ہوا۔ مگر ساتھ ہی غصّے کی ایک لہر اُبھر آئی۔ بڑی اکڑفوں دکھاتا تھا۔ کہاں جائے گا ۔ ہمارے مزدوروں کے نیتا ۔ شری رام دیال سوشلسٹ سماج کے کرتا دھرتا۔ ذرا اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالیں ۔ جی ہاں نچلے طبقے کا اخلاق بڑا بلند ہوتا ہے متوسط طبقے کے لوگ بے پیندے کے لوٹے ہیں جدھر پانی بہتے دیکھا بہہ نکلے۔

ابھی ذرا اپنے ساتھیوں پر تو نگاہ ڈالئے کیا یہی لوگ قوم کے معمار بنیں گے ؟ کیا سمجھ رکھا ہے اس نے میرا ڈیڑھ روپیہ ہضم کرلیا اور ڈکار تک نہ لی ۔ میں اسے بالکل معاف نہیں کروں گا ۔ کہتا تھا کہ چور بازار سے چھلنی خرید کر لاؤں گا ۔ اسے تو خود چور ہے ۔ تو چور بازار سے کیا لائے گا۔ دو ہفتے سے میرا منہ نہیں دیکھا چھپتا پھر رہا ہے ۔ محنت کش طبقہ ، عوامی قدریں ، نیا سماج ، اخوت جدلیاتی مارکسزم مائی فٹ ۔ سب کچھ ڈھونگ ، اصل کرتوت اور کردار دیکھ لیا نا آپ نے ۔ میرا ڈیڑھ روپیہ ہضم کرگیا ۔ میں اس کی پول کھول کر رکھ دوں گا۔

ویسے میں بھی دوستوں سے روپے اُدھار لیتا ہوں ۔ اور انھیں واپس نہیں کرتا مگر میری بات اور ہے ۔ مجھ میں اور بھنگی میں کافی فرق ہے ۔ میں نے کئی بار رشتہ داروں سے جھوٹ بول کر روپے اُدھار لئے اور پھر کبھی واپس نہ کئے ۔ میرے دوست مجھ سے بیس تیس روپے مانگ کر بیجاتے ہیں اور پھر کبھی واپس نہیں کرتے ۔ دوستوں کی بات اور ہے ۔ وہ روپے واپس نہیں کرتے تو کم سے کم چاپلوسی تو کرتے ہیں ۔ لیکن اس شخص کو کوئی حق نہیں کہ وہ میرے ڈیڑھ روپے پر ہاتھ صاف کردے ۔ کیا سمجھ رکھا ہے اس نے ؟

اگلی صبح وہ مجھے غسل خانہ صاف کرتے ہوئے مل گیا ۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے ۔

" کیا ہوا ۔ اس چھلنی کا " میں نے کڑک کر کہا ۔

" جی ۔ منشی نے کہا تھا کہ تمھیں لانے کی ضرورت نہیں ۔ میں لا دوں گا ۔ اسی لئے میں

پور بازار نہیں گیا۔"

"ارے کیوں جھوٹ بولتے ہو" میں غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ تم نے کہا تھا کہ تم خرید کر لاؤ گے میں نے تمھیں روپے دیئے اور سب کے سامنے دیئے ڈیڑھ روپے تمھاری گندی ہتھیلی پر رکھے اور تم ہفتے سے چھننی لا رہے ہو۔ بد دیانتی کیوں کر رہے ہو۔ مجھے اُلّو بنا رہے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمھیں روپوں کی ضرورت تھی۔ اور تم نے روپے خرچ کر لیے۔ کیا میں ہی اس بلڈنگ میں دھوکے بازی اور فریب کاری کے لیے رہ گیا ہوں۔ سُن! اگر کل تک چھننی لا کر نہ دی تو میں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ نوکری سے برخاست کراؤں گا تجھے۔" میں غرور اور فتح مندی کے لہجے میں بولا۔

"بس کل چھننی لاؤں گا۔ آپ اونچی آواز میں بات نہ کیجیے۔ میں بہرہ نہیں۔" وہ جھاڑو سے زمین صاف کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھئے جناب! میں نے محلّے والوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس عرصے میں کافی لوگ میرے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ اور میری باوقار شخصیت سے مرعوب ہو رہے تھے اور بڑی حقارت سے اس بھنگی کو دیکھ رہے تھے جناب آنکھیں کھول کر دیکھئے اور کان کھول کر سُنئے۔ اسے کہتے ہیں اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ روپے میں دوں اور اونچی آواز میں بات بھی نہ کروں۔ یعنی میں آپ کے کان میں رس ٹپکاؤں۔ آپ ہی فیصلہ کیجیے! قصوروار کون ہے؟ خیر میں کل تک کی مہلت دیتا ہوں۔

اس نے سب کچھ سُنا۔ اور کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے آہستہ آہستہ جھاڑو دیتا رہا۔ وہ زمین کو یوں سنوار رہا تھا۔ جیسے شاعر اپنی غزل کو سنوارتا ہے یا کوئی افسانہ نگار اپنے قلم سے ایک نیا شاہ کار لکھتا ہے۔ میں نے سوچا یہ بھنگی نہیں کوئی شاعر ہے۔ افسانہ نگار ہے اسے اپنے کام سے اتنی لگن کیوں ہے۔ یہ اتنا کم گو متین اور سنجیدہ کیوں ہے یہ سوچتا ہوا بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ میری اہلیہ محترمہ شاید کسی دوسرے کمرے میں برج کھیل رہی تھیں۔ میں نے کھلی فضا دیکھ کر خود بخود بڑبڑانا شروع کر دیا۔ آج کل کسی

پر اعتبار کرنا گناہِ عظیم ہے ۔ مزدور دیانت دار رہتے ہیں ۔ کیا کہنے ۔ شریف ہوتے ہیں مگر اپنا تجربہ تو اُلٹ ہی ہے اپنے قول وفعل کے پکّے ہوتے ہیں ۔ کسے انکار ہے ۔

اخلاق کے پاسبان ہوتے ہیں ۔ دیکھ لیا ۔ ان کا اخلاق ۔ میں سوچتے سوچتے اور بولتے بولتے کانپ گیا ۔ جی میں بلند آواز سے باتیں کر رہا تھا ، اور آپ بڑے نرم اور شیریں لہجے میں مجھ سے ہم کلام تھے ۔ جیسے آپ کسی کالج کے پرنسپل ہیں ۔ کہاں ہیں وہ رام دیال آزادی اور اخوت کے پرستار! میرے سامنے آجائیں ۔ کل چھنی نہیں لایا تو سالے کو جان سے مار دوں گا ۔ کتنی سنجیدگی سے بات کرتا ہے ۔ جیسے آپ کرسئ صدارت پر تشریف فرما ہیں ۔ سارے عملے کے سامنے بے عزتی کر دوں گا اور بتا دوں گا کہ ایک شریف انسان کے ساتھ کیسے دھوکا کیا جاتا ہے ۔ میں اس قسم کی توہین برداشت نہیں کر سکتا ۔ بلڈنگ کے بھنگی میرا کہا نہ مانیں اور مجھے اُلّو بنا دیں ۔ کیسا زمانہ ہے ۔ ارے بڑے آدمیوں کو تو بددیانتی کرنے اور دوسروں کو اُلّو بنانے کا حق ہے لیکن چھوٹے لوگوں کو مفلس اور نادار انسانوں کو ۔ بیمار مدقوق لوگوں کو بددیانتی کرنے کا کوئی حق نہیں ۔" میں غرّایا " میں اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا ۔

میرا خون کھول گیا ۔" میں جانتا ہوں ۔ وہ کل سے اس بلڈنگ میں نہیں آئے گا ۔ اس کا کیا ہے کسی دوسری بلڈنگ میں جھاڑو دینے چلا جائے گا ۔ مگر میں اس بدمعاش کا پیچھا کروں گا ۔ میں تاقیامت اسے نہیں چھوڑوں گا ۔ میرا ڈیڑھ روپیہ جناب ۔ یہ ڈیڑھ روپے کی بات نہیں ۔ یہ میری عزت ، شرافت ، انا اور شخصیت کا سوال ہے ۔ یہ ڈیڑھ روپیہ ڈیڑھ لاکھ روپے کے برابر ہے ۔ یہ میرے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے ۔ میں ۔ میں کسی کو امانت میں خیانت کرنے کا حق نہیں دیتا ۔ اور خاص کر اس بھنگی کو ۔ میں ٹہلتا ہوا بولتا گیا اور میرا خون کھولتا گیا ۔ اچھا ہوا ۔ اس وقت کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا ۔ نہیں تو اس قسم کے جنونی آدمیوں کو سیدھا پاگل خانہ بھیج دیا جاتا ہے ۔

دوسرے دن وہ سیڑھیاں صاف کر رہا تھا ۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے جھاڑو گر گیا ۔ گناہ کا احساس بیچارہ ڈر گیا میری شخصیت کی پرچھائیں کا اثر ہونے لگا تھا ۔ سیڑھیاں اُتر کر میرے قریب آیا ۔ اور کہنے لگا کہ یہ لیجیے اپنا ڈیڑھ روپیہ کون اس پھڈے میں پڑے ۔ منشی کہتا تھا میں خرید کر لاؤں گا ۔ تم نہ لانا ۔

اس لئے میں بھنگی بازار سے خرید کر لایا۔ آپ مجھے جھوٹا اور مکار سمجھتے ہوں گے کوئی بات نہیں "
اس نے اپنی میلی قمیص کی جیب میں اپنا میلا ہاتھ ڈالا۔ اور میری شفاف ہتھیلی پر ڈیڑھ روپیہ رکھ دیا۔ جب یہ ڈیڑھ روپیہ میری ہتھیلی پر گرا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی سانپ نے ڈنک مارا ہو۔ ایک لمحہ کے لئے سارا جسم لرز گیا۔ میری بنائی ہوئی قدروں کا محل دھڑام سے نیچے گرا۔ میں اس وقت اس بھنگی کے سامنے اتنا چھوٹا اور حقیر سا ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ زمین میں دھنس جاؤں۔ زندگی میں پہلی بار کسی معمولی آدمی نے مجھے شکست کا احساس دلایا تھا۔ میں بخشش کے طور پر اسے ڈیڑھ روپیہ دینا چاہتا تھا لیکن اس پر خلوص باوقار شخصیت دیانت دار شخصیت کے سامنے مجھ میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ میں اسے بخشش دینے کی کوشش کرتا اگر اس نے ناکر دی تو میرا حال کیا ہوگا۔ میں اپنی خفت اور ندامت کو چھپانے کے لئے سیدھا اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ اور اسے یہ المناک خبر سنائی وہ بھی یہ خبر سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ ایک لمحہ کے لئے بھونچکی سی رہ گئی۔

"لو یہ ڈیڑھ روپیہ بھنگی نے واپس کیا ہے "

"نہ۔ اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔

"کیوں ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اسے بھنگی نے چھوا ہے "

لیکن یہ میرا روپیہ ہے میں نے اسے دیا تھا۔ اس پر حکومتِ ہند کی مہر ثبت ہے دیکھتی نہیں یہ باوقار اشوک کا ستون اور اس کے اوپر شیر یہ میری جیب میں سے گیا تھا " میں خفا ہو کر چلایا۔

"آپ کی جیب کی بات اور ہے۔ وہ نرم لہجے میں بولی۔ جیسے کسی بڑی سچائی کو بے نقاب کر رہی ہو۔ میری بیوی نے فوراً نوکرانی کو بلایا اور کہا۔ اٹھا لے یہ ڈیڑھ روپیہ اور دھو کر لا۔ یہ گندا ہے "
میں اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے سکتے میں آگیا۔ میں نے اپنے دماغ کو جھنجھوڑنا چاہا۔ اچانک میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ کہ ان سکوں کی میل تو شاید پانی کے دھونے سے اتر جائے۔ لیکن یہ دلوں کی میل کیسے اترے گی۔ ﴿﴾

ممّی

"ممی۔ یو۔ آر۔ گریٹ ممی۔ میرے پاس آؤ۔ وسکی کا ایک اور پیگ لونا۔

"ڈونٹ بی سیلی۔ مائی سن۔" ممی چلائی۔

"بی۔ اے۔ گڈمدد۔ صرف ایک پیگ اور۔" ممی وسکی کی بوتل سے ایک پیگ ڈالتی ہے اور پینے والے ہاتھ میں گلاس دیتی ہے۔ "یو آر۔ گریٹ ڈارلنگ۔ تھوڑی برف۔ یہ برف کہاں سے لائی ہو۔ صبح میں نے نوکر کو بھیجا لیکن اسے برف نہ ملی۔ ممی یو آر سویٹ۔ میرے پاس آؤ۔ میرے قریب"

"ڈونٹ بی سیلی مائی سن۔ ممی پھر چلائی۔

"اگر میرے پاس نہ آؤگی تو میں چلا آؤں گا۔ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں تمھیں کتنا پسند کرتا ہوں ممی۔ تمھاری قسم مجھے کچھ معلوم نہیں، کہ میں تم کو کیوں پسند کرتا ہوں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ، میں تمھیں پسند کرتا ہوں ممی۔ میرے پاس آؤ۔ میرے قریب۔ تمھارا ہاتھ کدھر ہے .....؟

"تم نے بہت پی ہے مائی سن۔

" نہیں ممی ابھی میں اور پیوں گا۔ جی بھر کے پیوں گا۔ تم شراب پلاتی جاؤ میں پیتا جاؤں۔ شراب کتنی اچھی چیز ہے۔ شراب پی کر میں بہت باتیں کرتا ہوں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں

عشق اور محبت کی باتیں ۔ تمھاری باتیں ۔ غلامی کی باتیں ۔ ممی تمھارے ہاتھ بہت ہی خوبصورت اور ملائم ہیں ، نرم و نازک ۔"

ممی زور سے قہقہہ لگاتی ہے ۔

زور سے مت ہنسو ممی ۔ اس قہقہے سے بڑھاپے کی بو آتی ہے ۔ تم ذرا لطیف انداز سے ہنسو ۔ دبی دبی سی ہنسی ۔ خوش گوار ہنسی پیاری اور میٹھی ہنسی ۔ یو آر ۔ واقعی گریٹ ۔ ایک اور پیگ ۔

" بالکل نہیں ۔"

" میں تمھارے قریب آؤں گا ۔ تمھارے ساتھ بیٹھوں گا ۔"

" آجاؤ ــــ "

" کیا تمھیں کسی بات کا ڈر نہیں ۔"

" ممی میں تمھارا کن الفاظ سے شکریہ ادا کروں تم نے جس لڑکی کا پتہ دیا تھا ۔ میں اسی سے ملنے گیا تھا ۔

" کہاں "

" بمبئی میں ڈارلنگ ۔"

" پھر کیا ہوا ۔ ؟

" ممی وہ لڑکی مجھے بالکل پسند نہیں آئی ' دیکھتے ہی مجھے اس سے نفرت ہوگئی ۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں آئی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھے اجنبی سمجھ رہی ہے ۔ ممی میں تو تمھاری سفارش لے کر گیا تھا ۔ پھر بھی اس نے سیدھی طرح بات نہ کی مجھے کیا غرض تھی کہ اسے مناتا بہت مغرور تھی وہ ۔ اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا سمجھتی تھی ۔ اس کے سلوک ۔ اس کے برتاؤ ۔ اس کی باتوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ ہر ہندوستانیوں کو پسند نہیں کرتی اور میری جیب میں سفارش کے علاوہ روپے بھی تھے ۔ مفت کا مال تو نہیں تھا ممی ۔

"مجھے اُمید نہ تھی کہ وہ اس طرح Behave کرے گی" ممی نے شراب کے گلاس کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ممی میرے قریب آؤ۔ ـــ میرے نزدیک۔ میرے پاس آؤ۔ ذرا۔ ذرا اِدھر سرک آؤ۔ ممی۔ ہاں اتنی جلدی بوڑھی کیوں ہوگئی ہو" ؟

"ایک دن تم بھی بوڑھے ہو جاؤ گے۔ بالکل میری طرح صرف لمحہ بن کر رہ جاؤ گے لیکن۔ ہاں عورتیں بہت جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

"ممی تم مجھے پسند کیوں کرتی ہو۔

"کیوں کہ تم اچھے ہو۔ کیوں کہ تم خوبصورت ہو، جوان ہو۔ تم اتنے زور سے قہقہے لگاتے ہو کہ میرے بوڑھے جسم میں توانائی سی آجاتی ہے۔ میں جوان لڑکوں کی صحبت میں بیٹھ کر خوش رہتی ہوں۔ مجھے ہنسی اور قہقہوں سے انتہائی محبت ہے اور تم۔"

رک جاتی ہے۔

"جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہہ ڈالو"

"یہی کہ تم کمینے نہیں ہو۔" یہ کہہ کر ممی مسکرائی۔

"ممی ایک پیگ اور۔ تمھارے ہاتھوں کی قسم جو اتنے نرم اور ٹھنڈے ہیں۔ مجھے تمھارے ہر سانس سے محبت ہے"

"تم نے بہت پی لی ہے۔ اور اگر تم نے ایک اور پیگ پی لیا۔ تو قے کرنے لگو گے"

"نہیں ممی نہیں" تمھاری قسم نہیں، قے نہیں کروں گا میں کبھی قے نہیں کروں گا صرف ایک پیگ اور۔ تو تم بھی ایک پیگ اور۔ جب تم شراب پی لیتی ہو تو تم کافی حسین ہو جاتی ہو۔ تمھاری ہنستی ہوئی آنکھیں۔ چمک اٹھتی ہیں۔ اور تمھارے مرجھائے ہوئے چہرہ پر رعنائی سی آجاتی ہے۔ ممی تمھاری۔"

"اینگلو انڈین۔

"کیا تمھیں ہندوستانیوں سے نفرت ہے؟"

"بالکل نہیں میرے بیٹے مجھے صرف اس شخص سے نفرت ہے جو کمینہ ہو۔ اور وہ تمھارا دوست جو اپنے آپ کو شاعر کہتا ہے، وہ تو بہت ہی کمینہ ہے۔"

"کون سا شاعر ممّی۔"؟

"وہ کالا سیاہ سا۔ جس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ جو نہایت ہی بدصورت اور بے حیا ہے۔ اس کا دل بھی اس کے رنگ کی طرح سیاہ ہے۔ مجھے اس سے انتہا نفرت ہے۔"

"کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔"؟

"ایک دن کہنے لگا۔ مجھے لڑکی لادو۔ کم بخت اپنی صورت نہیں دیکھتا اور جس انداز سے اس نے مجھے یہ الفاظ کہے وہ انداز میں کبھی نہیں بھول سکتی اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اسے لڑکیاں لاکر کیوں نہیں دیتی۔ میں اسے شراب کیوں نہیں پلاتی۔ بھلا میں اس کالے سیاہ آدمی کو کس طرح اپنے گھر میں بلاؤں۔ میں بدصورتی سے نفرت کرتی ہوں۔ میں بدصورت آدمی کے ساتھ شراب نہیں پی سکتی کیا ہوا۔ کہ میں لڑکیاں سپلائی کرتی ہوں۔ یہ میرا پیشہ ہے کیا تم مجھ سے۔ نفرت کرنے لگو گے۔ اسی وجہ سے ..... !

"نہیں ممّی۔ بلکہ میں اس بے باک پن کی وجہ سے تم سے محبت کرتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ تم لڑکیاں سپلائی کرتی ہو۔ مجھے اس سے کیا غرض۔ لوگ اس سے بُرے کام کرتے ہیں۔ اور پھر میں تم سے کیوں نفرت کروں۔ میں کون سے اچھے کام کرتا ہوں۔"

"لیکن میرے بچے تم کمینے نہیں۔ تم دیانت دار ہو۔ تم میرا انداق نہیں اُڑاتے۔"

"ممّی نو موراٹاک۔ میرے قریب آؤ۔ آؤ۔ آؤ نا۔"

"ڈونٹ بی سیلی مائی سن ــــ مجھے اس شاعر سے نفرت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے ماروں پیٹوں، اس کی مسکراہٹ کو نوچ ڈالوں۔ وہ مجھے دلال سمجھتا ہے۔ کافر کہیں کا ــــ وہ مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کیوں کہ میں طوائف ہوں۔ یا طوائف رہ چکی ہوں۔ جیسے یہ جسم اس کے

باپ کا ہے۔"

"چھوڑو مت ممی"۔

" مجھے کہنے دو ـــ"

" ممی میرے قریب آؤ۔ اور قریب ـــ ناراض نہ ہو۔ یو۔ آر۔ سویٹ۔

" وہ مجھے سمجھتا کیا ہے۔ اس نے میرا مذاق کیوں اُڑایا۔ وہ مجھے نفرت کی نگاہ سے کیوں دیکھتا ہے شالا کہیں کا۔ کیا تم یہ جانتے ہو کہ پیشہ مجھے کیوں اختیار کرنا پڑا ـــ" ؟

" کیوں کہ تم یہ پیشہ اختیار کرنا چاہتی تھیں۔"

" بکومت۔ شاید تم نے ضرورت سے زیادہ پی لی ہے۔ میں طوائف کبھی نہیں بننا چاہتی تھی۔"

" تمھیں طوائف کون کہتا ہے۔ ؟

تمھارا شاعر۔"

" شاعر نہیں گدھا ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں ـــ وہ بے وقوف ہے۔"

" اب آؤ میرے قریب، اب تو خوش ہونا۔ وہ لڑکی بہت اچھی تھی۔"

" چند دن ہوئے تم نے میرے پاس بھیجی تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ کم بخت روپے بہت مانگتی تھی۔ ڈیڑھ سو روپئے ؟"

" کسی شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔"

" تو پھر کیا ہوا ـــ مجھے اس کی شرافت سے کوئی سروکار نہیں کہنے لگی تم میرے رسیلے ہونٹوں سے رس چُرا سکتے ہو۔ بس بس زیادہ کچھ نہیں۔ تمھیں عصمت اور کنوارے پن کی عزت کرنی چاہئے۔ رات بھیگتی رہی۔ اور میں اس کے شاداب لبوں سے تازگی حاصل کرتا رہا۔ شب بھر ہم نے ایک جان ہو کر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو جوانی کے خواب دیکھے۔ میں حسن و جوانی اور عصمت کی عزت کرنا جانتا ہوں۔ خوب جانتا ہوں۔"

"ہوں ــــ اور تمھارا شاعر ــــ کالا اور سیاہ ۔ چمنی کے دھوئیں کی طرح سیاہ ۔ آنکھوں میں آوارگی ۔۔۔۔ اور سینے میں بچھو کا ڈنک ۔ مجھ پر ہنستا تھا، کینہ ۔ مجھے طوائف سمجھ کر نفرت کرتا تھا جانتے ہو میرے بیٹے ۔ میری عُمر چودہ سال کی تھی ۔ جب میری ماں ہیضہ سے مرگئی ۔ اس وقت میں جوان تھی ۔ بہت سے گورے سپاہی ہمارے گھر آتے تھے ۔ ماں کے مرنے کے بعد میں اکیلی رہ گئی بالکل اکیلی تنہا اور ایک رات ایک گورے نے مجھے بہت پلادی ۔ اور اس رات حُسن فروشی کی طرف میرا پہلا قدم اُٹھا کہنے لگا میں تمھارے ساتھ شادی کروں گا ۔ میں تُم سے محبت کرتا ہوں ۔ لوسی ۔ اُن دنوں لوگ مجھے لوسی پُکارتے تھے ۔ لوسی نادان تھی ۔ جوان تھی ۔ گورے کی باتوں میں آگئی ۔ اور جب صبح ہوئی تو گورا کہیں بھاگ گیا تھا ۔ اور لوسی پھر اکیلی تھی ۔ میرے بچّے تُم اس وقت کہاں تھے ۔ تمھاری قسم میں اس وقت جوان تھی ۔ جسم میں پتھر کی سی سختی تھی ۔ اتنی سختی کہ چُٹکی لو تو پوریں چھل جائیں ۔ جسم میں سُورج کی سی گرمی تھی ۔ معلوم نہیں تُم اس وقت کہاں تھے ۔؟ اور اب ۔ اب تو بوڑھی ہو چکی ہوں ۔

"مَمّی یو ۔ آر ۔ گریٹ سوویٹ عورت ۔

"میں ان حالات میں کیا کرتی ۔ کیا میں راہبہ بن سکتی تھی ۔ کیا میں کسی ہسپتال میں نرس بھرتی ہو سکتی تھی ؟ بالکل نہیں مجھے دونوں پیشوں سے نفرت ہے ۔ جب جسم میں آگ ہو گوشت میں پتھر کی سی سختی ہو اس وقت عورت راہبہ نہیں بن سکتی نرس نہیں بن سکتی اور پھر میں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ۔ لوگ جوق در جوق آنے لگے ۔ میں نے ہمیشہ اُن لوگوں سے محبت کی ۔ جو مجھے پسند آئے ۔ میں نے یُوں ہی اپنے آپ کو غیروں کے حوالے نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ سوچ سمجھ کر میں نے اس جسم کا استعمال کیا ہے دیکھ لو اس عُمر میں بھی لوگ میرے پاس آتے ہیں ۔ میرے جسم کو خریدنا چاہتے ہیں ۔ لیکن میں ان کو گھر سے باہر نکال دیتی ہوں ۔ صرف جوان لڑکوں کے ساتھ بیٹھتی ہوں ۔ کیوں میرے بچّے ؟

"تُم اسے پیشہ کہتی ہو" ؟

"ہاں میرے بچّے تُم اپنا دماغ بیچتے ہو ۔ میں اپنا جسم بیچتی ہوں ۔ تجارت کرنے والے ۴۲۰ کر کے محل تیار کراتے ہیں ۔ اور میں جسم کی نمائش کر کے اپنا پیٹ بھرتی ہوں ۔ یہ دیکھو یہ چھوٹا سا گھر

اسی جسم کی بدولت تیار ہوا ہے۔ اور اگر تمھیں ان تجارت کرنے والوں سے نفرت نہیں تو مجھ سے بھی نہیں ہونی چاہیئے

"ممی شٹ اپ۔ یو۔ آر اسپوائیلنگ مائی موڈ۔ کیا میں نے تمھیں نہیں بتایا کہ میں بمبئی گیا تھا۔ اور پھر اس لڑکی کے گھر بھی گیا تھا۔ لڑکی نہایت ہی بدتمیز تھی۔ تمھاری قسم اس سے بالکل نفرت ہوگئی۔ اس نے مجھ سے اس طرح باتیں کیں، جیسے وہ ایک اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اور میں محض ایک حقیر انسان تھا۔

"مجھے اس کالے ہندوستانی سے نفرت ہے۔

"اور میں اس لڑکی کے گھر سے نکل کر بازار میں چلا گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ بازار میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔ لوگ جوق در جوق اکٹھے ہو رہے تھے کہ انڈین نیوی نے بغاوت کر دی ہے۔ بیس جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستانی نیوی زندہ باد۔ ہندوستانی فوج زندہ باد۔ کہو ممی "جے ہند"

"نہیں کہتی"

"تمھیں کہنا ہی پڑے گا"۔ "نہیں تو میں تمھارا سر پھوڑ دوں گا"

"مجھے جے ہند کا نعرہ پسند نہیں"

"لیکن ممی اس نعرے نے ہندوستان کو پھر سے بیدار کیا۔ ممی ایک گلاس اور ممی میرے قریب آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں، راز کی باتیں۔ پیار کی باتیں۔ ارے تم بمبئی نہیں گئیں۔ اگر تم نے یہ آزادی کی جنگ دیکھی ہوتی۔ تو ہندوستانی کی بہادری کی قائل ہو جاتیں۔ کہو انڈین نیوی زندہ باد"

"ہندوستانی بزدل ہیں۔ اور روپے کے لالچ میں آکر دوسروں کے لئے لڑتے ہیں۔

"نہیں ممی اب میں یقین نہیں کرتا۔ جو کچھ دیکھ کر میں آیا ہوں۔ اس کے بعد میں نہایت فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہم آزادی کے لئے لڑ سکتے ہیں۔ مر سکتے ہیں۔ ممی چھوٹے چھوٹے بچے

جے ہند کا نعرہ لگا رہے تھے۔ بچّوں کے ہاتھوں میں پتھر تھے لاٹھیاں تھیں۔ لیکن گوروں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں مشین گنیں تھیں۔ مقابلہ بہت سخت تھا۔ بچّوں نے بوڑھوں نے عورتوں نے گولیاں سینے پر کھائیں۔ اور جے ہند کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ کانگریس اور مسلم کے جھنڈے اکٹھے لہرا رہے تھے۔ اور اگر ان لوگوں کے پاس بھی بندوقیں ہوتیں ۔۔۔ تو۔۔۔"

"مائی گاڈ ڈونٹ ٹاک راٹ۔ مائی سن ۔۔۔

کون ۔۔۔" ؟

"وہی تمھارا شاعر ۔۔۔ میں اسے جان سے مار دوں گی۔"

"ممی شٹ اپ کہو جے ہند ۔۔۔"

"نہیں کہتی ۔۔"

"صرف Navy ہی نہیں۔ ایر فورس۔ مسلح فوج یعنی ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں پہلی بار سب ہندوستانیوں نے مل کر آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ اب اس طوفان کو کوئی نہیں روک سکتا۔ بندوقیں گولیاں۔ ہم ہندوستانیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے یہ ظلم اور یہ تشدد ہمارے آہنی عزم کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ اب ہندوستان آزاد ہو کر رہے گا۔

اور جے ہند کا نعرہ صرف بمبئی سے بلند نہیں ہوا کراچی سے کولمبو تک دلّی سے لے کر پشاور تک ہر شہر۔ ہر گاؤں سے نعرہ بلند ہو رہا ہے۔ اب ہمارا وطن آزاد ہو کر رہے گا۔

"تم نے بہت پی لی ہے۔"

"جب میں زیادہ پی لیتا ہوں۔ تو نہایت صاف اور واضح باتیں کرتا ہوں۔ نہایت کھری کھری باتیں۔ ممی میں تمھیں پسند کرتا ہوں مجھے تمھاری قوم سے نفرت ہے۔"

"وہ کیوں" ؟

"وہ اس ملک کو اپنا وطن نہیں سمجھتے وہ اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے وہ لندن سے

آ رہے ہیں ۔ ان کی حرکات عادات سب انگریزوں کی طرح ہیں ۔ مجھے ان کے رہنے سہنے پر کوئی اعتراض نہیں ۔ لیکن ان کے چہرے مہرے سے تمکنت برستی ہے ۔ غرور کا بے باک سایہ حکومت کا رعب ۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں ۔ ہندوستانی ہوکر ہندوستانیوں سے نفرت کرنا کہاں کی عقلمندی ہے ۔ لیکن ایک بات کے لئے انھیں پسند بھی کرتا ہوں ۔ وہ نہایت صاف اور ستھرے رہتے ہیں ۔ اگر وہ اس ملک کو اپنا وطن سمجھنے لگیں ۔

"مجھے اس پالٹکس سے نفرت ہے ۔ پرماتما کے لئے چپ ہو جاؤ ـــــ"

"کیا تمھیں خدا پر یقین نہیں"

"بالکل نہیں"

"پھر بھی تم زندہ ہو"

"کیا مذہب سے دلچسپی رکھتی ہو ـــ ؟

"مجھے مذہب سے نفرت ہے ۔

"شاید اسی لئے تم خوش و خرم رہتی ہو ۔ ممی انہیں باتوں کی وجہ سے میں تم کو پسند کرتا ہوں ۔ ممی تم اس دفعہ بمبئی نہیں گئیں ۔ ہندوستانیوں میں اب نئی تڑپ آ چکی ہے وہ ایک نئے عزم کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں ۔ اب اس ملک کو کوئی غلام نہیں رکھ سکتا ۔ ممی جے ہند کہو ۔ نہیں تو سر پھوڑ دونگا

"میں نہیں کہتی"

"ممی تمھیں کہنا ہی پڑے گا ۔ کہو ـــ" وہ ایک شراب کی خالی بوتل اٹھاتا ہے ۔ اور بوتل مارنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے ۔

"کہو جے ہند"

"جے ہند مائی سن"

"اچھا یہ بوتل رکھ دو ۔ ممی سورج کی طرف دیکھو ۔ اس آگ کی طرف دیکھو جو سورج اگل رہا ہے ۔ یہ سارا کرۂ ارض اس سرخ روشنی سے جگمگا اٹھا ہے ۔ یہ لانبے لانبے درخت ۔ یہ آسمان ۔ یہ شفق ۔ یہ

پہاڑ یہ دریا۔ سب کے سب اس روشنی سے جگمگا اُٹھے ہیں۔ کتنا حسین منظر ہے۔ یہ ایک نئی صبح ہے۔ نئی لے۔ نیا گیت۔ یہ آگ اب رُک نہیں سکتی اور پھیلے گی۔ اس سرے سے لے کر اس سرے تک۔

" دیکھتے نہیں سُورج غروب ہو رہا ہے۔"

اور دوسرا اُبھر رہا ہے۔ ایک تہذیب مٹ رہی ہے اور دوسری بن رہی ہے۔ ایک قوم مٹ رہی ہے۔ دوسری بن رہی ہے۔ کیا تمھیں یہ دکھائی نہیں دیتا۔

"تُم نے بہت پی لی ہے مائی سن۔"

"ممی۔ یو۔ آر۔ گریٹ۔ میں جانتا ہوں۔ تُم میرے ساتھ ہو۔ میرے قریب ہو۔ آؤ۔ میرے قریب آؤ۔ اس ٹھنڈے لمس سے مجھے سیراب کردو۔ جب کبھی تمھارے جسم سے ہمکنار ہوتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی گرم چشمے میں نہا رہا ہوں۔ ممی یو۔ آر۔ واقعی گریٹ۔ آؤ۔ آؤ میرے پاس آؤ۔

"میں تمھارے پاس ہوں۔

"لیکن اس وقت کے دھارے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ یہ وقت جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔ یہ وقت کی خلیج، یہ بڑھاپے کی لہر۔ جو مجھے تُم سے جُدا کرتی ہے۔

"اسی لئے میں تمھاری ممی ہوں۔ یو آر مائی سن۔ لیکن جب شراب پی لیتی ہوں، تو تُم میرے بیٹے نہیں بلکہ صرف ایک مرد۔ اور میں صرف ایک عورت اور میری ہولناک تنہائیں۔ اندھیرے میں تمھارا مضبوط اور توانا جسم ڈھونڈتی ہوں۔ اِدھر اُدھر چمگادڑوں کی طرح بھٹکتی ہیں۔ اور راستہ ڈھونڈتی ہیں۔ اور پھر رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور تُم میری آغوش میں ہوتے ہو مائی سن۔ یو ر ممی از گریٹ دس رسپکٹ۔"

"ممی شراب کا ایک اور پیگ لاؤ۔ نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں مرنا چاہتا ہوں اِن لوگوں کے ساتھ۔ ان بچوں کے ساتھ۔ ان عورتوں کے ساتھ جو اس جنگ آزادی میں مارے گئے ہیں' میں واقعی مرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں بزدل ہوں۔ میں نے صرف جے ہند کا نعرہ سُنا اور واپس آگیا۔

لوگ مر رہے تھے ۔ آزادی کے لئے ، ملک کے لئے ۔ اور میں دن بھر شراب پیتا رہا ـــــ ہہ اور تمھارے جسم کی گرمی سے لذت حاصل کرتا رہا ۔ ممی تم میرے لئے افیون ہو ۔ ایک نشہ ہو ۔ میں مرنا چاہتا ہوں ۔ میں واقعی مرنا چاہتا ہوں ۔ اپنی قوم کے لئے اپنے ہندوستان کے لئے ۔"

"یہ لو شراب کا پیگ ۔"

"شکریہ ۔ (شراب پی کر) ممی یو آر گریٹ ۔ گریٹ ۔

"شٹ اپ مائی سن ۔ مت بولو خاموش ہو جاؤ ۔ اندھیرا بڑھ رہا ہے ۔ شراب جسم کی نس نس میں سما رہی ہے ۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ ہر طرف اندھیرا اور کچھ نہیں ۔ آؤ ۔ آؤ ۔ میرے پاس آؤ ۔ تمھارے بالوں کو چوم لوں ۔ تمھارے جوان سڈول بازوؤں کو دیکھ لوں ۔ اب میں بوڑھی ہو چکی ہوں بالکل بوڑھی ۔ لیکن امنگیں ابھی تک جوان ہیں ـــــ بوڑھے جسم میں خون آہستہ آہستہ دوڑ رہا ہے ۔ لیکن یہ شراب ۔ یہ شراب ۔ یہ تیز و تند شراب " کچھ نہیں آزادی ، اور غلامی سب کچھ اس میں غرق ہو جاتا ہے ۔ مجھے نزدیک آنے دو ، یو آر سویٹ ۔ یو آر ونڈر فل مائی سن مائی ڈارلنگ ۔"

"ممی کہو جے ہند ۔"

"جے ہند مائی سن ۔"

(دونوں لڑکھڑاتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں ۔ اور اندھیرا دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے ۔)

دو بیل

رات آخری ہچکیاں لے رہی تھی، اور دور مشرق میں افقی لکیر پر روشنی جاگ رہی تھی۔ جُوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا۔ کرۂ ارض پر سورج کی ہلکی سفید روشنی چھا رہی تھی۔ بوڑھے احمد نے کھڑکی کھولی اور جھانک کر سامنے نگاہ دوڑائی، پورے بیس دن کے بعد اس نے اس کھلے میدان کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت کم بیمار ہوا تھا، غریبی میں بیماری آجائے تو سمجھو کہ غریب موت کی نذر ہوا۔ جو آدمی دن بھر کام کرے صبح سے لے کر شام تک سڑک پر پتھر کوٹتا رہے، یا دن بھر کسی فیکٹری میں گذارے، یا گندی نالیوں کو صاف کرے، بھلا وہ بیمار ہو جائے تو اس کی تیمار داری کون کرے۔ اور تیمار داری کے لئے روپیہ چاہئے۔ اور روپے کے لئے محنت بیماری میں محنت کب ہو سکتی ہے

بوڑھے احمد نے اٹھنا چاہا، لیکن ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی، اور کانوں میں سائیں سائیں کی سی آوازیں آنے لگیں۔ کھانسی زکام اور تیز بخار نے اس کا تمام خون چوس لیا تھا، اور اب وہ اس گنّے کی طرح سوکھا اور سکڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جس کا رس نچوڑ لیا گیا ہو، بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ اور چہرے پر سیاہی مائل رنگت چھا گئی تھی، گو آج بخار اور زکام سے آرام تھا۔ لیکن کھانسی بدستور تھی۔ یہ سالی کھانسی نہیں چھوڑتی کسی دن جان لے کر رہے گی، اور کھانستے کھانستے اس کی چھاتی دُکھنے لگتی۔ آنکھیں انگارے کی طرح لال ہو جاتیں، اور چہرے پر زردی

چھاجاتی، لیکن آج بوڑھے احمد کو کچھ افاقہ تھا۔ کھڑکی سے مُڑکر اس نے کمرے پر نگاہ ڈالی، کمرے کی حالت دیکھ کر اسے بہت کوفت ہوئی، ہر طرف پھٹے پُرانے کپڑے، ٹوٹے ہوئے برتن، پھٹی ہوئی دریاں، گندے لحاف اور ہر طرف اس کی بلغم کے نشان، کمرے کی دیواروں پر، زمین پر، کپڑوں، برتنوں پر، وہ کیا کرتا رہا ہے۔ سوائے تھوکنے کے اسے کوئی کام نہ تھا۔ اس نے باہر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، آسمان کتنا صاف اور نیلا تھا، دور مشرق کی طرف سفید براق بادل ہوا میں تیر رہے تھے، ہوا کتنی خوشگوار اور بھلی معلوم ہوتی تھی۔ گو وہ اس ہوا سے بچنا چاہتا تھا، کیوں کہ ہوا ٹھنڈی تھی، اس لئے اسے اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں بیماری کا دوبارہ حملہ نہ ہو جائے یہ موذی نمونیہ کمرے کی اس غلاظت اور گھٹے ہوئے ماحول کو دیکھ کر بڑھے گا احمد کو اپنے افلاس کا تلخ احساس ہوا، اسے معلوم ہوا کہ آج اس کا دیوالہ نکل گیا ہے، اور شاید یہ ٹھیک بات تھی۔ اس بیماری میں اس کا تمام اثاثہ لگ گیا۔ پہلے اس کا اثاثہ تھا ہی کتنا صرف چند روپے یا بانو کے گہنے، بانو نے اس دفعہ اپنی چاندی کے گہنوں کو بھی بیچ دیا تھا، بیچاری بانو! اگر بانو نہ ہوتی تو وہ کب کا قبر میں ہوتا۔ بچاری نے کتنی تن دہی سے اس کی تیمار داری کی تھی، دن رات ایک کر دیا تھا، کئی راتیں جاگ کر کاٹیں دوا دارو خود لاتی رہی، اس رات کو وہ کب بھول سکتا ہے۔ جب اس کے سینے میں زبردست درد اُٹھا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پھیپھڑوں میں ایک خنجر چبھو دیا گیا ہے، رات کے اندھیرے میں اس نے اپنے آپ کو قابو میں لانا چاہا، لیکن درد بڑھتا گیا، آخر وہ چلّانے لگا، اور بچاری بانو خدا اس کی عمر دراز کرے وہ غریب رات کے دو بجے جاکر دوا لائی، اور اسے دوا پلائی، تب جاکر کہیں آرام ہوا، کتنا ایثار ہے، کتنی بے لوث محبت ہے، بچاری بانو کو اس افلاس نے اسے کتنا نحیف کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غربت کے بے رحم خدا نے اس کے جسم کی تمام خوبیوں کو فنا کر دیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پچیس سال پہلے کی تصویر کھنچ گئی ــــ جب بانو پہلی بار اس کے گھر میں دلہن بن کر آتی تھی، وہ لال رنگ کا لہنگا پہنے ہوئے تھی، اور پیازی رنگ کی انگیا، اور یہ لمبا گھونگھٹ، جس میں اس کی شوخ نگاہیں لپے جھانک رہی تھیں۔ اس کے آنے سے گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگئی تھی، بھلا گھر میں لکشمی آئے

اور دولت مند نہ چوہے ۔ اتنا کام کہنے کو ملتا تھا، کہ اسے کام سے انکار کرنا پڑتا تھا۔ اور بانو کا بھرا بھرا سا جسم باہنوں کا گداز پن اور چہرے کے متناسب خدوخال، گو اس کا رنگ کالا تھا لیکن وہ کون سا گورا چٹا تھا، اور پھر اس کی آواز میں اتنی مٹھاس تھی، جو اس نے چاوڑی بازار کی طوائفوں میں بھی نہ پائی تھی، اور آج بانو کیا رہ گئی ہے، ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، آنکھوں کی چمک غائب، باہنوں کا گداز معدوم، آواز میں کرختگی اور چال میں نقاہت، بوڑھا احمد کچھ سوچ ہی رہا تھا، کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی، سامنے دیکھا تو بانو کھڑی تھی، ایثار اور محبت کا مجسمہ حسین اور خوبصورت جوان اور رسیلی، بوڑھے احمد نے اپنے سر کو زور کا جھٹکا دیا، اور آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے ملا، اور پھر بانو کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

"جانتے ہو آج کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، بچہ صبح سے رو رہا ہے، اور تم بستر پر سے ...."

"بانو میرے قریب آؤ"

"کیوں کیا کہتے ہو"

"یہی کہ میں چھکڑا لے کر بازار میں جاؤں گا۔ میں سسک سسک کر مرنا نہیں چاہتا۔"

بانو نے گردن ایک طرف جھکالی، اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اور پھر سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

"میرے پاس جو کچھ تھا تمھاری بیماری پر لگا دیا۔ حتیٰ کہ اپنے گہنے بیچ ڈالے، اب کیا کروں، کہاں جاؤں، بازار میں گئی تھی کہ کوئی کام مل جائے، لیکن بڑھیا کو دیکھ کر کون دیتا ہے، چھکڑا چلانا تو آتا نہیں، ورنہ خود چلی جاتی ...." اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔

"بانو گھبراؤ مت، جب تک زندہ ہوں، تم بھوکی نہ رہوگی۔ اللہ کی قسم جب تم روتی ہو تو میرا کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے، اور اگر تم زیادہ روئیں تو میں چھکڑا لے کر باہر چلا جاؤں گا۔"

"لیکن تم جاؤ گے کس طرح، کیا چھکڑا چلالو گے کیا اتنی طاقت ہے؟"

"آخر کیا کیا جائے بھوک سے مرا تو نہیں جاتا"

اتنا کہہ کر بوڑھا احمد اُٹھ کھڑا ہوا، اس کی بوڑھی رگوں میں ایک توانائی سی آگئی۔ گھر میں بھوک سے سسک سسک کر مرنے سے یہ بہتر ہے کہ ان بوڑھے ہاتھوں سے کچھ کام کیا جائے۔ جب وہ گھر سے باہر نکلا تو اس کی نگاہ اپنے بیل پر پڑی جو میدان میں ننگ دھڑنگ کھڑا تھا وہ اس درخت کی طرح تھا، کہ جس کے سائے تلے ہزاروں سستاتے تھے۔ لیکن اسے کوئی فائدہ نہ پہنچاتے ہوں۔ بیل دو دن سے بھوکا تھا۔ مالک کو دیکھ کر اس نے کان کھڑے کئے، بیل کے نتھنے پھول گئے۔ ٹانگیں ہلنے لگیں۔ اور دُم کو اپنے کھردرے جسم پر پھیرتے ہوئے اس نے امید بھری نظروں سے بوڑھے احمد کی طرف دیکھا۔ جیسے کہ وہ کہہ رہا ہو، کچھ تو دو۔ دو دن کا بھوکا ہوں۔ لاؤ کیا لائے ہو۔

بوڑھا احمد بیل کے پاس جاکر چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اس بے زبان جانور سے کس طرح اپنے دل کا حال کہے احمد نے بیل کی آنکھوں میں نمی کی جھلک دیکھی۔ اس کا دل کانپنے لگا۔ وہ کیا کرے۔ اس بیل نے زندگی بھر مدد دی ہے، یہ بیل کبھی بیمار نہیں ہوا۔ اور ہمیشہ کام کرتا رہا ہے۔ لیکن یہ بھی دو دن سے بھوکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں آنسو ہیں، شاید اس کے ایمان کی دیواریں بھی شکستہ ہو گئی ہیں۔

بوڑھے احمد کو اس بیل سے بہت محبت تھی۔ یہ بیل اس کا روزی رساں تھا۔ یہ ابھی بچھڑا ہی تھا کہ احمد نے اسے خرید لیا تھا۔ بوڑھے احمد نے اسے اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ پلایا۔ پالا پوسا۔ اور بڑا کیا۔ جب تک احمد کی زندگی میں بانو وارد نہ ہوئی تھی، احمد بیل کو منو کہہ کر پکارتا تھا اسے اس بیل سے محبت سی ہو گئی تھی، ایک محبوبانہ محبت۔ جس دن احمد پیسے زیادہ کماتا۔ تو وہ منو کو خوب کھلاتا۔ اس کے جسم پر مالش کرتا اور اس سے ہنس کر باتیں کرتا۔ اور جب کبھی رات کی تاریکی میں وہ اکیلا ہوتا، تو منو کے پاس چلا جاتا، اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتا۔ کبھی کبھی منو اس کے سر کو چاٹنے لگتا تھا۔ جیسے کوئی نرم نرم انگلیوں والی لڑکی اس کے سر کو سہلا رہی ہو۔ لیکن بانو کے آنے سے اس کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس جانور اور احمد کے درمیان جو محبت کا رشتہ

پیدا ہوگیا تھا، وہ ٹوٹنے کا نہ تھا، گو وہ منو کو اب اس شدت سے پیار نہ کرسکتا تھا کیوں کہ بانو کی رسیلی باتیں منو کی ابدی خاموشی سے کئی درجے بہتر تھیں۔ وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا، کہ بیل نے پیر مارنے شروع کئے۔ شاید وہ کہہ رہا تھا "بوڑھے میاں ماضی کے اوراق کیوں پلٹتے ہو، جانے دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ تم کس سوچ میں ہو۔"

احمد نے بیل کو چھکڑے میں جوتا۔ اور بیل چھکڑے کو آہستہ آہستہ کھینچنے لگا۔ نہ بوڑھے احمد میں اتنی ہمت تھی، کہ بیل کو تیز کر دیتا۔ اور نہ بیل میں اتنی سکت تھی کہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا۔ سورج نصف النہار پر آچکا تھا، گو سردیوں کے دن تھے، لیکن کافی گرمی ہوگئی تھی۔ بوڑھے احمد کے کھوکھلے جسم میں یہ دوپہر کی کڑکتی دھوپ بجلی کی مانند سرایت کرنے لگی۔ اس کے تمام جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ شاید یہ دھوپ کا اثر تھا۔ وہ منٹو روڈ سے ہوتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھا، پاس سے ایک جوان خوبصورت گھسیارن سرخ لہنگا پہنے ہوئے گذری۔ چال میں بلا کی شوخی، آنکھوں میں بے پناہ کشش۔ وہ دیر تک گھسیارن کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس نے سوچا کبھی میری بانو بھی ایسی ہی تھی۔

بوڑھے احمد نے دور سے آنے والے ایک چھکڑے کی طرف نگاہ ڈالی چھکڑا سبزی سے بھرا ہوا تھا سبزی کو دیکھتے ہی بیل کے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی۔ بوڑھے احمد نے بیل کو پچکارتے ہوئے کہا "یہ سبزی تمھارے لئے نہیں یہ سبزی انسانوں کیلئے ہے۔"

متواتر چار گھنٹے تک بوڑھا بیل کو ہانکتا ہوا اِدھر اُدھر کام کے لئے گھومتا رہا، دھوپ میں چلنے پھرنے سے اس کا بوڑھا دماغ چکرا گیا تھا۔ اس بیماری نے پھیپھڑوں کو دماغ تک کو کمزور کر دیا تھا۔ صبح سے اس نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ بیماری کی کمزوری اور نقاہت کیا کم تھی، کہ بھوک اور فاقے نے اسے نڈھال کر دیا۔ اب شام ہونے کو تھی۔ ہوا میں خشکی سی آگئی تھی، کبھی کبھی جب ٹھنڈی ہوا اس کے سینے سے ٹکراتی تو اسے کھانسی کا دورہ پڑ جاتا۔ اور وہ چھکڑے پر ہی کھانسنے لگتا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آتیں، منھ انگارے کی طرح گرم ہو جاتا۔ اور کنپٹیاں جلنے لگتیں اور بیچارا بیل حیران ہو جاتا۔ کہ آج میرے مالک کو کیا ہوگیا ہے۔

جوں جوں شام کی تاریکی بڑھتی جاتی، اس کے دل کی اداسی بڑھتی جاتی تھی، بوڑھے احمد کو روشنی اچھی لگتی تھی، یہ اندھیرا، یہ ابدی اندھیرا، زندگی کو تاریک کر دیتا ہے، پھیپھڑوں کو جلا دیتا ہے، ہوا کو غلیظ کر دیتا ہے، محبت کو بے زبان اور جوانی کو بوڑھا کر دیتا ہے، یہ اندھیرا نہیں، موت کی نشانی ہے، اسے روشنی اچھی لگتی ہے۔ اور وہ روشنی میں کام کر سکتا ہے لیکن آج کام نہیں ملتا، لوگ کہتے ہیں جنگ زوروں پر ہے، روزگار عام ہے، یہاں سے مال باہر جاتا ہے، باہر سے مال یہاں آتا ہے، لیکن پھر بھی کام نہیں ملتا، اور بھی ٹھٹو تو کہتے تھے کہ آج کل چھکڑے والوں کی ریل پیل ہے۔ آدمی کام کرنے والا ہو دن میں بیسیوں روپے کما سکتا ہے۔

شام کی تاریکی رات کی سیاہی میں تبدیل ہوگئی، آسمان پر ستارے چمکنے لگے، سڑکوں پر بجلی کے قمقمے روشن ہوگئے، اور اب بوڑھے احمد نے سوچا کہ اسے واپس گھر چلنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کاروان راستے میں رہ جائے اور اس میں اتنی طاقت بھی نہ رہ جائے کہ وہ اپنے آخری لمحے اپنے گھر پر گزار سکے، وہ سوچتا تھا کہ وہ بانو سے کیا کہے گا، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، کہ وہ کیا کرے، اتنی وسیع زمین پر اسے کام نہیں ملتا، لوگ بے تحاشہ اِدھر سے اُدھر بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ ٹرامیں بسیں، یہ لاریاں کدھر جا رہی ہیں، یہ لوگوں کا ہجوم یہ رنگ رلیاں یہ سبز ساڑھیاں، یہ موٹریں، یہ تانگے، یہ گھوڑے پالکیاں، یہ پھل پھولوں کی دکانیں، یہ سبزیوں کے چھکڑے یہ آٹے کی بوریاں۔ گندم کے گودام۔ گھی کے پیپے کہاں جاتے ہیں۔ یہ کہاں صرف ہوتے ہیں، وہ کیوں بھوکا ہے۔ اس کا بیل کیوں بھوکا ہے۔ اس نے اُوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے مسکرا رہے تھے۔ اسے نہایت غصّہ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے پاس اتنی لمبی مشعل ہو کہ وہ ان مسکراتے ہوئے تاروں کا مُنھ جھلس دے۔ صدیوں سے غریب کی غربت پر مسکرائے جا رہے ہیں بے شرم۔ ڈھیٹ۔ بے حیا۔

یکا یک فضا کو چیرتی ہوئی ایک آواز آئی۔ "او چھکڑے والے"

بوڑھے احمد نے مُڑ کر ایک موٹی توند والے انسان کو دیکھا۔

"کام کرو گے"؟

"کیوں نہیں حجور۔"

"دس من سامان ہے۔ کیا لو گے ؟"

"دس آنے حجور۔"

"پانچ آنے ملیں گے۔" موٹی توند والا آگے بڑھ گیا۔

"ٹھہریئے بابو صاحب، مجھے پانچ آنے منظور ہیں۔"

"اچھا تو اسٹیشن پر جاؤ۔ گودام میں دس بوریاں ہوں گی۔ یہ لو فارم اسے سنبھالو۔ یہ کاغذ دے کر بوریاں لے آنا۔ سیدھے چاندنی چوک رام رکھامل کی دوکان پہ پہنچنا۔"

بوڑھا احمد یہ کام پاکر خوش ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔ بجھتے ہوئے دیئے میں ایک بوند تیل کی بھی دیئے کی روشنی کو بڑھا دیتی ہے۔ اور بوڑھا احمد اپنی زندگی کو بڑھانا چاہتا تھا۔ یہ پانچ آنے نہیں پانچ روپے ہیں۔ آج خدا نے اس کی دعا سن لی ہے۔ وہ چھ پیسے سے بیل کے لئے گھاس خریدے گا۔ دو پیسے کا بچے کے لئے دودھ۔ دو آنے کے چنے اور ایک آنے کا گڑ۔ لو اس کا کھانا تیار ہو گیا۔ لیکن یہ لوگ کھانا بھی چھیننا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ غریب ہوا میں رہے۔ ہوا کھائے اور ہوا پہنے۔ بوڑھے احمد نے بیل کی رسی کھینچی اور بیل دوڑنے لگا۔ شاید بیل سمجھ گیا تھا۔ کہ اس کی آخری دوڑ ہے۔ اگر آج اس میں رہ گیا تو کہیں کا نہ رہے گا۔ وہ موڑ گزر کر داہنے ہاتھ کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں سڑک پر روشنی کم تھی، اور دو درختوں کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں نے سڑک کو اور بھی تاریک کر دیا تھا۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ یا کبھی کبھی دور سے لاری کے ہارن کی آواز آتی تھی۔ ہوا سرد اور بھاری ہو چلی تھی۔ سامنے کی طرف دھوئیں کا غبار بنتا۔ جو آنکھوں کو چندھیائے دیتا تھا بوڑھا احمد سردی کی وجہ سے سکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹانگوں کو اکٹھا کئے وہ سر کو ٹانگوں سے ملائے ہوئے ایک عجیب انداز میں بیٹھا ہوا تھا، کہ کسی کی آواز آئی "ٹھہرو چھکڑے والے۔"

آواز بھاری تھی اور ہوا میں گونجتی ہوئی آواز میں ایک قسم کا رعب تھا، جو یکلخت بوڑھے کے جسم پر طاری ہو گیا۔ ہاتھ رک گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی غیبی طاقت نے اس کے ہاتھ شل کر دیئے

ہیں - اس نے بائیں طرف دیکھا۔ تو ایک لحیم شحیم سپاہی کھڑا تھا۔ سپاہی نے عقابی نظروں سے بوڑھے کو تاکا اور پھر بیل پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، یکایک سپاہی کی نظریں بیل کی ٹانگوں پر جم گئیں اور پھر اس کی آنکھوں میں معنی خیز شرارت ٹپکی۔ اب وہ اس جرنیل کی طرف جس نے ایک عظیم الشان مہم سر کی ہو، اس نے بوٹوں کی ایڑیوں پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں بڈھے، تجھے شرم نہیں آتی، کہ اس غریب جانور پر اتنا ظلم ڈھاتا ہے۔"

"حضور کیا بات ہے۔؟"

"حضور کا بچہ" سپاہی نے کڑک کر کہا۔ اس کی کڑک میں حکومت کی طاقت پنہاں تھی۔ "خود کھا کھا کر موٹا ہوتا جاتا ہے، اور دیکھتا نہیں بیل کی طرف کتنا پتلا دبلا ہے۔ بے زبان جانور پر تشدد کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی، دیکھ اس کے پاؤں کی طرف خون بہے جا رہا ہے۔ کیا آنکھوں سے اندھا ہے۔ بینائی ختم ہو چکی ہے۔"

"حضور آپ مائی باپ ہیں۔ بھلا دیکھوں تو کہاں سے خون بہہ رہا ہے، صبح تو بھلا چنگا تھا۔"

"دیکھو اس پاؤں کی طرف۔"

سپاہی نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اور کسی کو نہ پا کر بوڑھے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ یہ نگاہیں کچھ مانگ رہی تھیں۔

بوڑھا اس بے زبان کی بات سمجھ گیا۔ لیکن بیچارہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ اور اگر ہوتی تو آج اس نقاہت اور کمزوری میں گھر سے باہر کیوں نکلتا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "حضور آج کچھ نہیں ہے۔ کل آپ کی مدد کروں گا۔"

سپاہی کی آنکھوں میں سے شرارت نکلنے لگے، اس کا منہ غصے سے لال ہو گیا۔ اس نے بوڑھے کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ "بے زبان جانوروں پر ظلم کرتے ہو۔ جی چاہتا ہے تمہارا بھیجا نکال دوں۔ حرامی، بوڑھا کھوسٹ۔ میں ابھی بتاتا ہوں کہ جانوروں پر ظلم کرنے سے کیا سزا ملتی ہے۔"

سپاہی نے بوڑھے کو چھکڑے سے نیچے اُترنے کو کہا، اور بیل کو چھکڑے سے علیحدہ کر کے آگے ہانکنے لگا۔ "رہنے دو۔ چھکڑے کو یہیں رکھو۔ تم لوگ جانوروں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آؤ گے۔ جب تک تمھیں پوری سزا نہ ملے۔"

دوسرے دن جب بوڑھا احمد انسداد بے رحمی کے محکمے میں گیا تو اسے معلوم ہوا کہ بیل ہسپتال میں معائنے کے لئے بھیج دیا گیا ہے۔ اس لئے اسے بے رحمی کے ہسپتال میں جانا چاہیے۔ وہ خود حیران تھا کہ، وہ کیا کرے اگر اس کا بیل اس سے چھن گیا، تو وہ کیا کرے گا۔ زندگی کی آخری کرن ہمیشہ کے لئے مفقود ہو جائے گی۔

جب وہ بے رحمی کے ہسپتال میں پہنچا تو اس نے اپنے سامنے ایک گورے چٹے انسان کو دیکھا جو ایک کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی؟"

"کیا یہ تمھارا بیل ہے"؟

"جی حجور۔" بوڑھے نے بیل کی طرف نگاہ ڈالی۔

"ہم نے اس کا معائنہ کیا ہے، اس کے خون میں تپ دق کے جراثیم ہیں، تم لوگ بہت بدمعاش ہے، بہت بے رحم ہے، کتنا ظُلم کرتا ہے جانوروں پر، یہ جانور تمھیں روٹی دیتا ہے، لیکن تم اسے مارتا ہے۔ اور دن رات بھوکا رکھتا ہے۔ اسے پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے یہ بیماری ہو گئی ہے۔

"حجور ایسی بات تو نہیں ہے۔ میرا بیل بھلا چنگا ہے، اسے کوئی بیماری نہیں ہے، کل تک بر راجی خسی تھا۔ بیمار تو میں ہوں۔ بیس دن سے بیمار ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری بیوی بھوکی ہے، میرے بچے بھوکے ہیں۔"

ڈاکٹر نے غضبناک ہو کر کہا۔ "کیا ہم جھوٹ بولتا ہے۔ بے شرم کہیں کا، چپڑاسی اس بوڑھے کو دھکے دے کر باہر نکال دو۔ اس بیل کو ہسپتال میں پہنچا دو، اور وارڈ میں داخل کر دو، اس کا علاج ہم کریں گے۔

"حضور ہم بھوکے مرجائیں گے۔ میری بیوی میرے بچے۔"

"سرکار تمھارے بال بچوں کی ذمہ دار نہیں۔ ہم کیا کریں۔ نکل جاؤ۔ چپڑاسی نکال دو اس بوڑھے کو۔"

اور جب بوڑھا احمد دروازے سے نکلا تو اس نے سوچا کہ کیا اس دنیا میں کوئی ایسا ہسپتال نہیں ہے، جہاں ان انسانوں کو داخل کیا جائے، جن پر بے رحمی کی جاتی ہے، وہ اب اکیلا تھا، بالکل تنہا۔ اس درخت کی طرح جو صحرا میں اکیلا ہو، اس نے جانا کہ وہ اس پرندے کی طرح ہے جس کے پر ہمیشہ کے لئے کاٹ دیئے گئے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دُنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے کانوں میں ٹراموں، کاروں، اور رکشاؤں کی ٹن ٹن کی آوازیں تھیں۔ لیکن یہ شور لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا گیا۔ وہ اب اس زمین کے قریب جا رہا تھا جہاں ابدی اندھیرا ہو جاتا ہے، اور روشنی کی کرن ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتی ہے۔

چائے کی پیالی

کامنی میری بیوی ہے ۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے تقریباً بارہ سال ہو گئے ہیں۔ اور آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ ان بارہ برسوں میں میری اور کامنی کی کبھی لڑائی نہیں ہوئی ۔ گو یہ عرصہ اتنا لمبا ہے کہ لڑائی تو ہونی چاہئے تھی ۔ اگر اس عرصے میں طلاق کی نوبت آجاتی تو بھی اچنبھے کی بات نہ تھی ، لیکن میری بیوی کی بات اور ہے اس قسم کی بیویاں ذرا مشکل سے ملتی ہیں ۔ کامنی سے میری ملاقات آج سے بارہ برس پہلے ایک خوبصورت دوپہر کو ہوئی تھی ۔ ایک ایسی دوپہر ، جب سورج ٹھیک سر پر تھا ۔ اور اس نے ہم دونوں کو اتنا قریب کر دیا کہ آخر میں ہم دونوں کو ہمیشہ کے لئے ایک ہونا پڑا۔

اگر آپ میری بیوی کو دیکھیں گے تو آپ اسے قبول صورت ضرور کہیں گے ۔ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ مجھے بے حد حسین اور خوبصورت نظر آئی تھی ، میں نے سوچا کہ ایسی لڑکی دنیا کے کسی کونے میں نظر نہیں آئے گی ۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں ، جو اب پیلی پیلی ہو گئی ہیں لیکن اب بھی مجھے نیلی ہی نظر آتی ہیں ، اس وقت بڑی پُر کشش اور دل آویز دکھائی دیں اور جب میں نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے سر سے لے کر پاؤں تک قیامت دیکھ لی ۔ میرے سارے بدن میں ایک کپکپی دوڑ گئی تھی ۔ ایسا سُندر اور سڈول جسم میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ میرے ان لفظوں کو نا پسند کریں جو میں نے اپنی بیوی کے بارے میں استعمال کئے ہیں

اور مجھے اپنی بیوی کے بارے میں استعمال نہیں کرنے چاہئیں، لیکن میں آپ سے عرض یہ کردوں کہ میری بیوی میری محبوبہ بھی ہے ۔ اور محبوبہ کے بارے میں اس قسم کے جملے لکھنا کوئی بے ادبی نہیں ہے ۔

جہاں تک میری بیوی کی سیرت کا تعلق ہے وہ بے مثال ہے ۔ صورت اور سیرت کی وجہ سے میں اس کے اتنا قریب آگیا کہ پھر پیچھے نہ ہٹ سکا ۔

جب ہم پہلی بار اس چلچلاتی دھوپ میں ملے تو نہ جانے کامنی نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے وہ مجھے سب کچھ سونپنے کے لئے تیار ہے ۔ بغیر کسی جھجک کے اتنا بھروسہ کسی انسان پر نہیں کرنا چاہئے ـــــ خاص کر پہلی ملاقات میں ۔ لیکن یہی ادا مجھے پسند آئی اس ادا نے مجھے ہمیشہ کے لئے اس کا گرویدہ بنا لیا ۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں ۔ کامنی کو جتنی محبت مجھ سے تھی، یا ہے یا جتنی محبت مجھے اس سے ہے یا ہونی چاہیے، اس کا ذکر بے کار ہے لیکن ایک بات صاف ظاہر ہے کہ اس محبت کا انجام بہت خوشگوار ہوا ۔ یعنی کچھ عرصے کے بعد ہم دونوں اکٹھے اکٹھے رہنے لگے ، اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خاوند بیوی تسلیم کرلیا ۔

اس میں کوئی شبہ کی بات نہیں کہ سب سے پہلے مجھے اس کی صورت پسند آئی اور پھر سیرت ـــــ اور دس سال گزرنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میری بیوی کی صورت اور سیرت تو گوارا تھی ، دراصل پس پردہ جنسی بھوک کارفرما تھی ۔ جس نے مجھے اس کی سیرت اور صورت دونوں کا عاشق بنا دیا تھا ۔

میں شروع ہی سے خودسر واقع ہوا ہوں، جو جی میں آتا ہے کرتا ہوں ، میں نہیں چاہتا کہ کوئی آدمی میرے معاملات میں دخل دے ۔ لیکن دوسروں کے معاملات میں ضرور دخل دیتا ہوں ۔ میں کسی کی نصیحت سننا نہیں چاہتا ، لیکن دوسروں کو نصیحت ضرور کرتا ہوں ۔ دراصل یہ بات اتنی اہم تھی کہ مجھے اپنے والدین سے مشورہ کرلینا چاہئے تھا اور اگر صلاح نہ لے سکا تھا تو کم سے کم خبر تو ضرور کرنی چاہئے اور اگر میں اپنے ماتا پتا سے صلاح نہ لے سکا تو کم سے کم اپنے بڑے بھائی سے مشورہ

کرنا چاہئے تھا یا ان بزرگوں سے بات کرنی ضروری تھی جن کے کندھوں پر دھرم اور اخلاق کا بوجھ ہمیشہ پڑا رہتا ہے اور جو نوجوانوں کو نصیحت کرنے کے لئے ہمیشہ بیتاب نظر آتے ہیں۔ تاکہ ان کا یہ اخلاقی بوجھ کسی طرح کم ہو سکے۔ لیکن میں نے کسی کی پروا نہ کی۔

میں نے سوچا کہ کامنی سے میں محبت کرتا ہوں اور کامنی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اب بھلا کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ بے چاری کامنی اتنی بھلی مانس کہ میرے والدین کے بارے میں کچھ نہ پُوچھا۔ میں نے سوچا کہ میری بیوی اگر اتنی ترقی پسند ہے تو مجھے رجعت پسند بننے کی کوئی ضرورت نہیں (بعد میں معلوم ہوا کہ کامنی کے ماتا پتا ایک زمانہ ہوا مر کھپ گئے تھے اور بے چاری اس دُنیا میں بالکل اکیلی اور شاید تنہا تھی۔ شاید اسی لئے اس نے میرے والدین کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا) بہر حال ہم دونوں کو ایک دوسرے پر اتنا بھروسہ تھا کہ ہم کسی تیسرے کو بیچ میں لانے کے لئے تیار نہ تھے۔

جب ہم دونوں اکٹھے رہنے لگے تو اس اکٹھے رہنے کو ہم نے شادی کا نام دے دیا ـــ جی ـــ شادی اور کس بلا کا نام ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہم دونوں کسی پنڈت کے پاس نہیں گئے اور نہ ہی ہم نے سول میرج کی۔ میں نے سوچا، دو دلوں کا میل ہے اور ہم ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا چاہئے؟"

اِس دوران میں کامنی نے کبھی اس قسم کی خواہش ظاہر نہ کی جس سے کہ مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ قانونی طور پر شادی کرنا چاہتی ہے ـــ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے دل میں کبھی سوچا ہو۔ لیکن اس نے مجھ سے کبھی نہیں کہا نہ ہی اس نے اس بارے میں کبھی شکایت کی۔

میں اپنی بیوی سے بے حد خوش ہوں۔ گو قانونی نکتہ نگاہ سے وہ میری بیوی نہیں ہے بلکہ میری محبوبہ ہے یا آپ اسے میری داشتہ کہہ سکتے ہیں۔ سب سے اچھی بات اس میں یہ ہے کہ جس کی وجہ سے میں اس کا پرستار ہوں کہ وہ ہر صبح چائے کی ایک گرم گرم پیالی مجھے بنا کر دیتی ہے۔ جب میں آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا ہوں، اور پلنگ پر لیٹ کر اور کبھی بیٹھ کر، اس چائے کو آہستہ

آہستہ پیتا ہوں تو دُنیا کی باقی تمام لطافتیں بھول جاتا ہوں۔ صرف چائے کا مزا میری زبان پر رہ جاتا ہے۔

تقریبًا بارہ برسوں سے ہر صبح کامنی چائے بنا کر مجھے دیتی ہے۔ ہر صبح آسمان نیلا ہو یا آسمان پر نیلے بھورے بادل چھائے ہوں۔ بارش برس رہی ہو یا کسی طوفان کی آمد ہو وہ صبح اُٹھتے ہی اسٹوو سلگا کر، چائے بنا کر پیالی میرے ہاتھوں میں دے کر پھر سو جائے گی۔

ان بارہ برسوں میں کئی انقلاب آئے۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہوا، اور ہمارے تین بچے بھی ہو گئے۔ بڑے پیارے اور خوب صورت بچے ہیں۔ مجھے اپنے بچوں پر بڑا ناز ہے۔ میرے بچوں کو مجھ پر فخر ہے یا نہیں، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بڑے خوبصورت بچے ہیں میرے، آپ کی کیا رائے ہوگی، اگر آپ انھیں دیکھ لیں۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کامنی اتنی پڑھی لکھی بھی نہیں ــــــ لیکن اتنی اَن پڑھ بھی نہیں کہ آپ کی باتیں نہ سمجھ سکے۔

یہ اور بات ہے کہ کسی وجہ سے وہ آپ کی باتوں کا جواب نہ دے۔ ہماری ازدواجی زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ دراصل ایک عام انسان کو اور کیا چاہیئے؟ ایک اچھی بیوی، تین بچے، تین کروں کا فلیٹ، کماؤ خاوند، ہر ماہ ایک پکچر دیکھ لینا۔ میاں بیوی کا آپس میں خوش و خرم رہنا، بس یہی کچھ زندگی ہوتی ہے، اور کیا چاہیئے؟

جھگڑا ہم دونوں کا آپس میں کبھی نہیں ہوا۔ لیکن ایک دو سال کے بعد جب کبھی میری اماں ادھر آئیں تو گھر میں ذرا بدمزگی سی پیدا ہو جاتی۔ میری اماں ذرا پُرانے خیالات کی ہیں۔ شروع میں پروٹسسٹ کے طور پر دو تین سال وہ میرے فلیٹ میں نہیں آئیں۔ پھر وہ غصّے کو پی گئیں۔ ماں کی ممتا بیٹے کی خودسری پر غالب آگئی۔ اور وہ میرے گھر بہو کو دیکھنے چلی آئیں۔ لیکن انھوں نے اس بہو کو اپنی اصلی بہو کبھی نہیں مانا۔ اور وہ اکثر اس بات کا چرچا کرتیں۔

اس بار کہنے لگیں۔ "بیٹا اب بھی سمے ہے شادی کر لو۔"

"ماں تم بھی کیسی عجیب باتیں کرتی ہو؟ ہم دونوں کو اکٹھے رہتے ہوئے بارہ برس ہو گئے ہیں۔ تین بچے ہیں جنہیں ہر روز تم دیکھتی ہو ـــــ اور پھر کہتی ہو کہ شادی کر لو......"

"ارے، یہ کوئی شادی ہوئی؟ نہ برات آئی، نہ پنڈت بلایا، نہ باجے بجے، نہ پھیرے پڑے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ اسے شادی نہیں کہتے۔ ابھی سمے ہے شادی کر لو۔ تین بچوں کے باپ ہو۔"

میں کامنی کی طرف دیکھتا، وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی اور میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ کتنی سمجھ دار تھی میری کامنی کتنا بھروسہ تھا اسے مجھ پر۔ کبھی کبھار میری ماں کامنی کی طرف داری کرتی اور کہتی :۔

"اگر تم نے کامنی کو چھوڑ دیا تو کہاں جائے گی؟ اس کا خرچا پانی کون دے گا؟ کورٹ میں جا کر دعویٰ نہیں کر سکتی؟ اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ واقعی تم نے اس سے شادی کی ہے؟"

"ماں ہم دونوں ایک مکان میں رہتے ہیں، ایک ہی چھت تلے زندگی کے بارہ برس گزار دیئے ہیں۔ پرماتما کی کرپا سے تین بچے ہیں۔ اور کیا ثبوت چاہیئے۔؟"

"بچے تو کسی داشتہ کے بھی ہو سکتے ہیں۔" وہ جھنجھلا کر کہتیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو! کیا میں اس طرح کا آدمی ہوں؟ کیا میں اتنا گر سکتا ہوں کہ کامنی کو چھوڑ دوں گا۔"

"گرے ہوئے نہیں ہو، لیکن گر سکتے ہو" وہ بحث کو آگے بڑھاتیں۔

ایسے موقعوں پر کامنی بیچ میں ٹوک دیتی ـــــ ماں جی! "مجھے ان پر بھروسہ ہے۔"

"اری مرد کی ذات پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے ـــــ تم دونوں شادی کر لو۔ دیکھو کتنا مزا آئے گا؟" وہ کامنی کو بھی میری طرف دیکھ کر اس عمر میں لالچ دیتیں۔

اس طرح چھوٹی موٹی لڑائیاں اکثر ہوتی رہتیں۔ ذرا کچھ دنوں تک بدمزگی سی رہتی۔ اور

جب اماں گھر واپس چلی جاتیں تو ہم ان باتوں کو بھول جاتے، دراصل یہ بات چند قریبی رشتہ داروں کو ہی معلوم تھی اور بہت کم لوگوں نے میری اس خودسری کو سراہا تھا۔ میں نے بیاہ شادی کی تمام رسومات کے پرخچے اُڑا دیئے تھے اور انسان کی شرافت پر زیادہ بھروسہ کیا تھا۔ اگر میری بیوی زیادہ سمجھ دار نہ ہوتی تو اچھا خاصہ خون خرابہ ہو جاتا۔ شامت اعمال سے ان ہی دنوں میرے چچازاد بھائی اسی شہر میں وارد ہوئے۔ بدقسمتی سے وہ وکالت کرتے تھے جب اس نئے شہر میں ان کی وکالت کہیں اور نہ چلی تو وہ گھر میں میری بیوی کی وکالت کرنے لگے۔ ہم دونوں ایک ہی اسکول، ایک کالج اور ایک ہی ہوسٹل میں اکٹھے رہتے تھے۔ بھلا میں انھیں کیا کہتا۔ اگر میں کچھ کہتا بھی تو کیا وہ میری بات سنتے۔

ایک دن وہ کامنی سے کہنے لگے:۔

"اگر تمھارا پتی اس دُنیا سے اچانک چل بسے تو قانونی طور پر تُم اپنے خاوند کی جائداد کی مالکن نہیں بن سکتیں، اور نہ ہی تمھارے بچے قانونی طور پر اپنے باپ کی جائداد کے وارث بن سکتے ہیں۔"

میں نے یہ بات سُن لی اور فوراً بولا:۔ ارے بھئی کوئی جائداد ہو تو اس کا کوئی وارث بنے گا۔"

"اچھا نہ سہی جائداد، ان تین کمروں میں جو سامان رکھا ہے اس کا وارث کون ہوگا؟"

"میری بیوی۔"

"یہ تمھاری بیوی نہیں ہے۔"

"تو کس کی ہے؟" میں نے جل کر کہا۔

"میں قانونی نقطۂ نگاہ سے کہہ رہا ہوں، پیارے۔"

"تمھارے قانون سے کیا ہونا ہے، کیا تمھاری وکالت کہیں اور نہیں چلتی؟ دُنیا بھر کے قانون یہیں چھانٹتے پھرتے ہو۔" میں نے غصّے میں آکر کہا۔

"کسی اور وکیل سے پوچھ لو، اگر مجھ پر یقین نہ ہو۔"

"میں مرنے سے پہلے وصیت کر جاؤں گا۔"

"اگر اچانک ہارٹ فیل ہو گیا؟ ــــ جیسا کہ آج کل لوگوں کا ہو رہا ہے، تو؟"

"تو پھر کیا ہوا! یہ سب کچھ ان ہی کا ہے۔" میں نے کامنی کو یقین دلایا۔

"تمھارے آفس کے فنڈ کا کیا ہوگا؟" انھوں نے نیا سوال کھڑا کر دیا۔

"وہ میری بیوی کو ملے گا!"

"کیسے ملے گا؟"

"آفس والوں کو کیا معلوم کہ میں نے قانونی طور پر کامنی سے شادی نہیں کی ہے۔"

"اگر معلوم ہو جائے تو ــــــ؟" انھوں نے "تو" کو اس طرح کھینچا جیسے جیتنے کے ہاتھ میں کھلاڑی زور سے ترپ کا پتہ پھینکتا ہوا۔"

"میں جا کر خبر کر دوں، یا تمھارا بھائی۔"

"میں تم سے اس بات کی اُمید نہیں کرتا ــــ اور میرے بھائی اتنے اوچھے نہیں ہیں۔"

"اگر ہو جائیں گے تو ان کا کیا کر لو گے۔؟ تم اپنے بچّوں کا مستقبل خراب کرنا چاہتے ہو۔"

"فی الحال میرے بچّوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے، ویسے میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہر بچّہ اپنا مستقبل ہوتا ہے۔"

"کیمونزم کا پرچار مت کرو۔ ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کرو۔ اور سوچو!"

یہ صاحب تو لڑ جھگڑ کے چلے جاتے، لیکن فضا میں زہر گھول جاتے اور اس کا اثر اب اڑوس پڑوس میں پھیلتا تھا اس واقعہ کے بعد میری بیوی نے اپنی سہیلی کملا سے یہ بات کہہ دی۔ یہ سنتے ہی وہ ہکا بکا رہ گئی۔ بے چاری میری بہت عزّت کرتی تھی۔ یہ سننے ہی اس نے کچھ ایسے تیور بدلے کہ وہ مجھے چور اور بدمعاش سمجھنے لگی۔ ایک دن وہ میری بیوی سے بولی:-

"ہائے رام ـــــ آپ دونوں نے ابھی تک شادی نہیں کی ؟ کئی برسوں سے آپ دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔ اور پھر آپ دونوں نے بچے بھی پیدا کر لئے ـــــ یہ ـــــ یہ تو ـــــ حرامی بچے ہیں ـ" آخر اس کے دل میں آئی ہوئی گالی زبان پر آ ہی گئی ۔

یہ سن کر کامنی کو بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنی سہیلی کو ڈانٹ کر کہا :۔

"خبردار ! اگر دوبارہ ایسی بات کہی ۔ نہیں تو زبان کھینچ لوں گی ۔"

"زبان تم کھینچ لو۔ لیکن سچی بات کہنے سے نہیں ڈروں گی ۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی ۔

یہ بات محلے میں ایسی پھیلی کہ لوگوں نے نگاہیں پھیر لیں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رام اور سیتا اجودھیا نگری میں بارہ برس کے بعد لوٹے ہیں ، دھوبیوں کو سیتا پر بھروسہ نہ رہا تھا ۔ راون کے سائے گھرے ہوتے جا رہے تھے ، جیسے ہم دونوں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا تھا ۔ چونکہ ہم دونوں کا من صاف تھا ۔ ہم نے لوگوں کی کانا پھوسی کی پروا نہ کی ۔ بدقسمتی سے انہی دنوں میرے ماتا پتا تشریف لے آئے ۔ اور پھر محلے کے دھوبیوں کی ایک سمٹ کانفرنس ہوئی کہ میں لاجواب سا ہو گیا ۔ سب نے بچوں کے مستقبل کے بارے میں ایسی خطرناک باتیں کہیں کہ مجھے ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی ۔ لیکن اس دوران میں کامنی نے اس خیال کی پرزور تائید نہ کی ۔ میں جانتا تھا کہ کامنی کو مجھ پر بھروسہ ہے ۔

اب بات خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی والدین نے زور دے کر مجھے اس بات پر راضی کر لیا کہ قانونی طور پر اب شادی کر لینی چاہیئے ۔ یعنی ایک پنڈت کے سامنے ۔

یہ کچھ عجیب سی بات لگ رہی تھی کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ شادی کر دوں ۔ اور وہ بھی بارہ برس کے بعد ـــــ اور جب کہ ہم تین بچوں کے ماں باپ بن چکے ہوں ۔

میری ماں کہنے لگی ۔" میں بینڈ بجواؤں گی ۔ لڈو بانٹوں گی ، سارے محلے کی عورتیں بلوا کر

گیت گواؤں گی۔"

"یہ بکواس نہیں ہوگی ماں۔"

اور یہ تیری بکواس چلے گی؟ رہنے دے اپنے گھر کے قانون۔ تمھارا کیا ہے جب جی میں آئے گا بے چاری کو چھوڑ دو گے۔ میں اس طرح نہیں ہونے دوں گی۔"

خیر بڑی مشکل سے میں شادی پر راضی ہوا۔ شادی ہوگی، لیکن بینڈ نہیں بجے گا، لڈو نہیں بانٹے جائیں گے۔ صرف پانچ چھ ہی رشتہ داروں کو بلایا جائے گا۔ پنڈت آئے گا، اور میری ماں میری بیوی کو دُلہن بنا کر گھر لائے گی۔ پھر میں اپنی دُلہن کا چہرہ دیکھوں گا۔

اس لڑائی جھگڑے میں کامنی کچھ نہ بولی۔ شادی کا دن آ گیا۔ ایک ہال میں منڈپ بھی بن گیا۔ سات آٹھ براتیوں کے سامنے کامنی دلہن بن کر آئی۔ اس دن کامنی مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ لال رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ بانہوں میں لال رنگ کی چوڑیاں جو میری ماں خرید کر لائی تھی۔ آنکھوں میں حیا کے ڈورے، کچھ شرمائی ہوئی، لجائی ہوئی، سر کو ڈھانپتی ہوئی، بدن چرائی ہوئی، ماتھے پر بندیا۔ کچھ نئے گہنوں سے لدی ہوئی میرے پاس بیٹھ گئی۔ جی میں آیا کہ ایک زور کا قہقہہ لگاؤں، لیکن چپ ہو گیا۔ کامنی کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ اس کے رخسار حیا سے تمتما اُٹھے تھے۔ اتنی کمسن اور معصوم وہ مجھے کبھی نہ لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی کنواری ہے اور مجھے پھر سے تین بچے پیدا کرنے ہوں گے۔

پھر باقاعدہ شادی ہوگئی۔ پنڈت کے سامنے میری ماں میری بیوی کو بہو بنا کر لائی۔ محلے کی عورتیں بھی آئیں۔ اچھا خاصہ ہنگامہ ہو گیا۔ دوسرے دن میرے ماتا پتا چلے گئے۔

شادی کے تیسرے دن کی بات ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ میری آنکھ ابھی تک کھلی نہ تھی۔ ادھ کچی نیند تھی اور چائے کی پیالی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اپنی دُلہن بیوی کی طرف دیکھا، وہ بڑے مزے سے سو رہی تھی۔ میں نے باورچی خانے کی طرف نگاہ ڈالی۔ اسٹوو ٹھنڈا پڑا تھا۔ میں اپنی چارپائی سے اُٹھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بارہ برسوں میں

پہلی بار سوئی ہو اتنی پُرسکون نیند شاید اسے کبھی نہ آئی تھی۔ خاوند کے حق کو آزمانے کی خاطر میں نے نئی نویلی دُلہن کی چادر کھینچ کر کہا ـــــ "ارے اُٹھو تو ـــــ چائے بنا کر لاؤ۔ کیا تماشہ ہے؟ ابھی تک سو رہی ہو؟"

کامنی نے چادر کو اپنے جسم پر تانتے ہوئے کہا۔ "جی ہیں بارہ برس سے ہر صبح آپ کے لئے چائے بناتی رہی ہُوں بارہ برس تک ہیں آپ کی محبوبہ رہی۔ آج سے میں آپ کی بیوی ہوں، ذرا چائے بنا کر مجھے پلاؤ ـــــ"

یہ کہہ کر وہ بڑے مزے سے کروٹ بدل کر چادر سے اپنے جسم کو ڈھک کر سوگئی۔ میں سفید چادر کی طرف تکتا رہ گیا۔

☆

جہاں میں رہتا ہوں

میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمھیں کیا لکھوں، وہ کون سا مضمون ہے، جس پر ادیبوں نے خامہ فرسائی نہیں کی۔ تم نے لکھا ہے کہ تم عورت کی محبت کے متعلق کیوں نہیں لکھتے، یہ قصہ بہت پرانا ہو چکا، اور میں نے عورت کے محبت کے متعلق اتنا لکھا ہے کہ میرا جی ان باتوں سے اکتا گیا ہے، اب جی چاہتا ہے کہ میں اپنے متعلق لکھوں، کچھ اپنی اداسی، اپنے غم، اپنے دکھ کی نسبت، شاید تم اس اداسی، اس غم، اس افسردگی میں اہلِ دل کی اداس روح کی ایک جھلک دیکھ سکو۔!

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہوگا کہ میں کتنی دور سے چل کر یہاں آیا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادیوں کا چکر کاٹ کر، پنجاب کے حسن سے متاثر ہو کر، دہلی اور لکھنؤ کا طواف کر کے، اور پونا کے ملیریا بخار سے سیراب ہو کر بمبئی پہنچ گیا ہوں۔ آخر اتنا لمبا سفر کیوں ——؟ کیا اتنی پھیلی ہوئی دُنیا میں میرے لیے کوئی مقام نہ تھا کہ میں ہندوستان کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے تک پہنچ گیا ہوں۔ پھر بھی مجھے سکون نہیں ملتا، راحت نصیب نہیں ہوتی، خوشی محسوس نہیں ہوتی۔

لوگوں نے بمبئی کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ بمبئی کی ٹراموں، اور بسوں، اور ریلوں کو سراہا ہے۔ لیکن میں ان فلک بوس عمارتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا۔ مجھے ان ٹراموں اور بسوں میں بیٹھ کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی، ہاں جب کبھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں، تو دل کو سکون سا مل جاتا ہے، یہ پھیلا

ہوا وسیع سمندر، اور اس پر کالے کالے جھکے ہوئے بادل، جیسے کسی دوشیزہ کے سیاہ بال — اور دور، بہت دور۔ ایک کشتی لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں، اور پھر سمندر کے کنارے ناریل کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ ناریل کے درخت خوب لمبے ہوتے ہیں سرو اور یوکلپٹس کے درختوں سے بھی اونچے اور لمبے۔ جب ہوا زور سے چلتی ہے تو یہ درخت ہوا میں جھومتے اور لہراتے اور آپس میں ایک عجیب انداز سے سرگوشیاں کرتے ہیں اور رات کے وقت جب ہوا ان درختوں میں سے گزرتی ہے تو ایک عجیب سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ان کے لانبے لانبے پتے ہوا میں لہراتے ہیں۔ کسی جوان لڑکی کے آوارہ بالوں کی طرح — چاند کسی شرمائی ہوئی دلہن کی طرح ان لانبے درختوں کی اوٹ میں چھپا رہتا ہے، لیکن چاند کی ریمیں کرنیں سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہوتی ہیں۔ ان کو چومتی ہیں۔ ان سے کھیلتی ہیں، لہریں بڑھتی ہیں اور ساحل سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ شور بڑھتا ہے اور پھر مدھم ہو جاتا ہے۔ ریت کے ذرے ان چمکتی ہوئی کرنوں میں چمک اٹھتے ہیں اور سمندر کی تازہ تازہ، پاک اور صاف ہوا، ناریل کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی ایک اداس نغمہ پیدا کرتی ہے۔

بمبئی میں مجھے تین چیزیں پسند آئی ہیں، سمندر، ناریل کے درخت اور بمبئی کی ایکٹرس اصل میں ان تین چیزوں سے بمبئی زندہ ہے، اگر ان تین چیزوں کو بمبئی سے نکال دیا جائے تو بمبئی بمبئی نہ رہے، شاید دہلی بن جائے یا لاہور، دہلی ایک معمولی، بے کیف سا شہر۔ میں یہاں کیوں آیا؟ اس کی وجہ تم جانتے ہی ہو، وہی پرانی، روزگار کی تلاش، پیٹ کا مسئلہ بہت پرانا ہے۔ مگر انسانوں نے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ اگر اس مسئلے کا کوئی خاطر خواہ حل ہوتا تو بنگال میں اتنی موتیں نہ ہوتیں، یہ ہولناک جنگ برپا نہ ہوتی، یہ بھوک، یہ غریبی، یہ پیاس نہ ہوتی، اس وقت میری جیب میں صرف چار آنے ہیں، اور باہر ناریل کے پتوں پر سورج کی کرنیں رقص کر رہی ہیں، اور دور گرجے کی صلیب پر ایک کوا کائیں کائیں کر رہا ہے۔ اور میری بھوک ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن مجھے روزی کی اتنی فکر نہیں، آخر پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے، کہیں نہ کہیں تم کو ایسا

دوست مل جاتا ہے اور پھر ہم دونوں کسی ریستوران میں چلے جاتے ہیں۔ اور کھانا کھاتے ہیں۔ ہیں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے روپے ادھار لے لیتا ہوں، مگر یہ روپے کبھی واپس نہیں کرتا۔ کہہ دو یہ کمینہ پن ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں، بھوک ہی کمینہ پن سکھاتی ہے، سرمایہ دار مزدور کی روزی چھین کر عالی شان محل تیار کرتا ہے، فیکٹریاں بناتا ہے اور بال بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے یورپ بھیجتا ہے۔ تو کیا یہ کمینہ پن نہیں؟ جابر کمزور کو مغلوب کرکے ایک عالی شان سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے، کیا یہ کمینہ پن نہیں؟ حاکم محکوم کو کچل کر، پیس کر، حکومت کرتا ہے، کیا یہ زذالت نہیں؟ اور اگر میں اپنے مالدار دوستوں سے چند ٹکے لے لیتا ہوں تاکہ اپنی بھوک ... یں کو بُھلا سکوں، تو کیا میں کمینہ ہو گیا؟ چھوڑو میاں۔ تمھارے سماج کی عجیب قدریں ہیں، اور میں ہر گام، ہر قدم پر اور ہر منٹ اور ہر سکنڈ ان کھوکھلی قدروں کو توڑنا چاہتا ہوں، ان قدروں کا مضحکہ اڑانا چاہتا ہوں۔ چاہے تم مجھے کمینہ کہو یا گنوار۔

پہلے میں شیواجی پارک میں رہتا تھا، یہ جگہ ایکٹر اور ایکٹرسوں کی پسندیدہ ترین جگہ ہے، شیواجی پارک کے چوک میں کھڑے ہو کر تم تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سڑک کی ہر نکڑ پر، کسی نہ کسی موڑ پر، حلوائی کی دکان پر یا ایرانی کے ریستوران میں۔ تم ایکٹروں کو دیکھ سکو گے۔ یہ لوگ ایسے ہی عامیانہ انداز سے رہتے ہیں جیسے تم یا میں۔ یہاں آکر ایکٹر اور ایکٹرسوں کو دیکھنے کو جی نہیں چاہتا، کیوں کہ ہر روز تم انھیں دیکھ سکتے ہو۔ اور جو چیز ہر روز دیکھی جائے۔ اس کی دلکشی جاتی رہتی ہے۔

تم نے یونہی پریتما کی تصویر مانگی ہے۔ ارے بھئی، چھوڑو ان ایکٹرسوں کو، کیوں دردِ سر مول لیتے ہو۔ بے چاری پریتما اب کافی موٹی ہو گئی ہے، کسی اور ایکٹرس کا نام لو۔ کوئی ہو بھی تو —— شاید جناب تمھیں پسند آئے۔ میری نگاہوں میں یہی ایک ایکٹرس ہے جسے ایکٹرس کا پارٹ دیا جاسکتا ہے، باقی تو پھول کر کپّا ہو گئی ہیں، ہندوستان میں ایکٹر اور ایکٹرسوں کو اپنے جسم کا بالکل خیال نہیں رہتا۔ ایک بار ہیروئن کا رول مل گیا تو بس لگیں موٹی ہونے، نہ کمر رہی، نہ سینہ، نہ آنکھوں میں شوخی نہ بالوں میں چمک۔ گالوں پر گوشت چڑھنے لگا، یہاں تک کہ چہرے کے خطوط غائب ہو گئے۔ کولھے اتنے پھیلے کہ ٹانگیں ندارد، سینہ اتنا بڑھا کہ پیٹ بن کر رہ گیا۔ اب بتاؤ، کیا کرو گے ان کا فوٹو لے کر۔ کل ہی میں نے میٹرو

کے سامنے ایک قسم کا اشتہار دیکھا، اشتہار پر مغربی ناچنے والی لڑکیوں کی ٹانگیں دکھائی گئی تھیں، صرف ٹانگیں۔ اُف کیا ٹانگیں تھیں، کتنی سڈول اور گداز۔ گداز اور سڈول، جیسے سانچے میں ڈھلی ہوں کتنی خوب صورت، دل کش، توانا اور صحت مند۔ کتنی پُرفریب، جیسے نگاہوں میں جذب ہو رہی ہیں تمام ہندوستان چھان لو، اتنی خوب صورت، متناسب، موزوں ٹانگیں نہیں ملیں گی۔ میاں ان لوگوں سے پوچھو کہ خوب صورت ٹانگیں کس طرح تیار ہوتی ہیں، سڈول بازو، بھری ہوئی چھاتیاں، صحت مند جسم کس طرح بنتا ہے، اور پھر یہ قوس، جو عورت کی خوب صورتی کی روح ہوتی ہے کہاں سے آتی ہے۔ کس طرح بنتی ہے۔ شرمانے کی کوئی بات نہیں، تم کہو گے، ہندوستان مفلس ہے، غریب ہے، لیکن یہ ایکٹرسیں تو غریب نہیں، یہ تو ہزاروں روپے ماہوار کماتی ہیں۔ لیکن خوب صورتی کا احساس کس کو ہے، یہاں تو عورت کو گٹھری بننے پر مجبور کیا جاتا ہے، اور اگر عورت گٹھری بن گئی تو مجھو حسن کا مجسمہ تیار ہو گیا یہاں تو خوب صورت جسم پر غلاف چڑھائے جاتے ہیں، مبادا ان ٹانگوں میں زندگی آجائے اور یہ ٹیڑھی سیدھی ٹانگیں چلنے پھرنے لگیں۔ مرنے اور جینے کے انداز ان مغربی لوگوں سے سیکھو میاں، ابھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ بہت پیچھے۔

ارے کر رہا تھا بات پریمیا کی کہ ذکر آ گیا براڈوے گرلز کی ٹانگوں کا اگر اتنے ہی بے بس اور مجبور رہتے ہو تو چند دنوں کے لئے بمبئی آ جاؤ، تمہارا ہندوستان کی تمام مشہور ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ شہرت کے اسی قدر بھوکے ہیں جتنے تم انھیں دیکھنے کے لئے ترستے ہو، آخر یہ لوگ بھی انسان ہیں۔ میں یوں ہی ایکٹرسوں کے جھمیلے میں پڑ گیا۔ کر رہا تھا ذکر اپنا، درمیان میں بے چاری ایکٹرس آ گئی۔ تم نے میرے مکان کا پتہ پُوچھا ہے، میں تمھیں کیا بتاؤں میں کہاں رہتا ہوں۔ پہلے میں شیوا جی پارک میں رہتا تھا۔ وہاں سے کیوں چلا آیا۔ لو اس کی وجہ بھی سنو۔ میں ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ آج کل کسی کو یوں ہی دوست بنانا اتنا ہی آسان ہے، جتنا کہ دشمن۔ میرا دوست جس کا نام تم R رکھ سکتے ہو، ایک نہایت ہی پہلوان قسم کا انسان ہے، جسم دیکھو، تو جی پھڑک اُٹھے، ورزش کا بہت شوقین۔ وہ دن رات ورزش کرتا تھا، ہر وقت جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خواب دیکھتا تھا۔ دراصل اس کا سپنا اب حقیقت بن چکا تھا۔ بچارے میں صرف ایک خامی تھی، یہ کہ وہ عورت

کو دیکھ کر گھبرا جاتا تھا، اسی لئے وہ عورتوں کی طرف بالکل نہیں دیکھتا تھا۔ میرا مطلب ہے جوان عورتوں کی طرف۔ اگر میں کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ کرتا تو وہ اس بات کو بُرا سمجھتا۔ کبھی کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ میرے دوست کا نقطۂ نظر درست ہے۔ آخر یونہی اپنے دل و دماغ کو پراگندہ کرنے سے کیا فائدہ۔ ہر وقت عورت کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ورزش کی جائے، ڈنڑ پیلے جائیں، من من، دو دو من کے پتھر ہر روز اُٹھائے جائیں اور جب انسان پتھر اُٹھا اُٹھا کر تھک جائے تو سمندر کے کنارے سیر کرنے چلا جائے اور سمندر کی اَن گنت لہروں کو گنتا رہے۔ ہر طرف لہریں ہی لہریں یا پانی ہی پانی ـــــ دور، نظروں سے دور جہاں سمندر اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر کو چومتا ہے اور پھر گہرے نیلے پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ ہر طرف سُرخی ہی سُرخی پھیل جاتی ہے، آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل شفق کی سُرخی سے چمک اُٹھتے ہیں، اور ٹھنڈی، تازہ، زندہ ہوا بادلوں کو چومتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے، ناریل کے درخت پیار بھری نظروں سے جھانکتے ہیں، اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو ہوا میں تحلیل ہوتی جاتی ہے۔ اس نظارے کو چھوڑ کر کسی عورت کے پیچھے بھاگنا حماقت ہے، سراسر حماقت ہے۔

اگر تم میرے دوست کو دیکھو تو یہی کہو گے، یہ کتنا متناسب، حسین تراشا ہوا یونانی بت ہے، اس کی آنکھوں میں سرسبز گھاس کی نیلاہٹ ہے، اور اس کے رُخسار پکے ہوئے سیب کی طرح سُرخ۔ اگر تم اس کے قریب بیٹھو، تو ایک عجیب صحت مند خوشبو اس کے جسم سے نکلتی ہے، جو صرف خالص گھی کھانے سے، دودھ پینے سے یا سُرخ ٹماٹروں کے استعمال سے یا عورت کی طرف نہ دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے، عورتیں اکثر میرے دوست کی طرف دیکھتی ہیں، نگاہوں میں آرزو ہوتی ہے، جسم کو چھونے کی خواہش ہوتی ہے، بس یہ دیکھنے کے لئے کہ اس بُت میں کیا ہے، اس کے بازو اس قدر سڈول کیوں ہیں۔ اس کی چال میں کیوں ایک زندگی ہے۔ اس کی نگاہوں میں کیوں ایک چمک ہے لیکن میرا دوست عورتوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ اکثر میں اسے لیکچر دیا کرتا ہوں کہ بھئی عورت سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آخر عورت بنی کس لئے ہے، عورت سے اس قدر دور رہنے سے کیا فائدہ۔ آخر زندگی میں ہر

شخص کا نصب العین ایک خوبصورت جسم بنانا تو نہیں ہے۔ میری طرف دیکھو، میں چاہتا ہوں کہ میری صحت اچھی رہے اور میں تندرست رہنے کے لئے تھوڑی بہت ورزش بھی کر لیتا ہوں۔ لیکن میں پہلوان بننا نہیں چاہتا۔ میں زندگی میں ورزش کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً میں اس لڑکی کو، جو اکثر بالکونی کے دروازے میں کھڑی رہتی ہے، نہایت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں، تم نے نہیں دیکھا اسے، دیکھا ہوگا، اور ضرور دیکھا ہوگا۔ میں نے تمھیں اکثر دیکھا ہے کہ تم چاندنی بسیں روشنی سے متاثر ہوکر باغ میں چلے جاتے ہو اور ہری ہری گھاس پر ایک سفید چادر بچھا کر لیٹ جاتے ہو، اور اپنے جسم کو چاندکی ٹھنڈی کرنوں کے حوالے کر دیتے ہو، اور دیر تک ان سمیں بر فیلی کرنوں میں نہاتے رہتے ہو۔ بھلا یہ کیوں۔ تم نے اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ بھی تو چاند ہی کا ٹکڑا ہے۔ اس کے جسم سے بھی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ مگر یہ کرنیں عجیب سی ہوتی ہیں، میٹھی، ہلکی، نرم، گداز ـــ نیند آجاتی ہے ان کرنوں سے مجھے بھی نہانے دو ان کرنوں میں۔ تم نے کبھی چاند کو چھونے کی تمنا کی ہے! ضرور کی ہوگی۔ چاند اس کائنات میں مسرت کا سرچشمہ ہے، میں بھی اپنے کرنوں کے منبع کو چھونا چاہتا ہوں، میں اس لڑکی کو نہایت قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں، میں اس کو خوف زدہ کرنا نہیں چاہتا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اسے میری موجودگی کا علم ہو جائے کہ وہ انسان جو ہر روز اس کی بالکونی کے نیچے سے گزرتا ہے، اسے کتنا پسند کرتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ ایک نہایت پاک اور مقدس خواہش ہے۔ آخر اس لمبے بالوں والی لڑکی سے تمھیں کیوں نفرت ہے۔ کیا ہوا اگر اس نے تمھاری طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھا، کیا ہوا اگر وہ ایک دن تمھارے کمرے میں اچانک آگئی اور اس نے اپنے آپ کو تمھارے حوالے کرنا چاہا، لیکن تم نے اس کی بے عزتی کی، اور اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے، تم سمجھتے ہو کہ تم نے ایک نیک کام کیا اور ایک لڑکی کی عصمت کو بچایا، لیکن تم نے اس کی محبت کا سرچشمہ ہمیشہ کے لئے خشک کر دیا۔ آج کل وہ کیوں اداس رہتی ہے، تم نے اس کے گالوں کی زردی کو نہیں دیکھا، تم نے اس کی نگاہوں کی تشنگی اور بھوک کا کبھی اندازہ نہیں کیا، تم ورزش کر کے اور گھی پی کر سو گئے اور وہ بے چاری

محبت کی جھلستی ہوئی آگ میں جل بھن کر سوکھتی چلی گئی۔ مجھے ایسی شرافت پسند نہیں، میں جانتا ہوں کہ جب تمھیں عورت کی یاد ستاتی ہے تو تم کیا کرتے ہو، اس وقت تم کیوں ٹھنڈے پانی سے بار بار غسل کرتے ہو، مگر آخر کب تک ؟ اگر دُنیا کے تمام انسان ٹھنڈے پانی سے نہانا شروع کر دیں تو دُنیا اس چیز سے محروم ہو جائے جسے محبت کہتے ہیں۔ محبت ہی زندگی کا محور ہے، اس کے بغیر زندگی بے جان ہے، بے کیف ہے۔

ہاں اس دن کی بات ہے کہ ایک نوجوان لڑکی میرے کمرے میں آگئی، میرے دوست نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ اس نے اس بات کو ناپسند کیا۔ اور یہ بات برداشت نہ کر سکتا تھا کہ کوئی لڑکی اس کے گھر کی طرف رُخ کرے۔ میرے دوست نے اس لڑکی کو گالیاں دیں اور کہا کہ وہ رنڈی ہے، ایک بدمعاش عورت ہے۔ لڑکی بچاری تکتی رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے نیا نیا دھندا شروع کیا تھا اور وہ ان لوگوں سے آشنائی کرنا چاہتی تھی جو کم ازکم اسے اچھے لگیں۔ اس سے پہلے وہ ایک لڑکے سے محبت کر چکی تھی اور اب وہ میری طرف مائل بہ پرواز تھی۔ میرے دوست نے لڑکی کو بے عزت کر کے گھر سے باہر نکال دیا اور میں دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میرا دوست اَن پڑھ ہوتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا، لیکن جو شخص پڑھا لکھا ہو اور پھر ایک طوائف کو گالی دے کہ وہ کیوں طوائف ہے، وہ کیوں اپنا جسم بیچتی ہے، تو صاف ظاہر ہے کہ وہ شخص زندگی کے بنیادی مسئلوں سے آگاہ نہیں، وہ انھیں بالکل نہیں سمجھتا اور اگر سمجھتا بھی ہے تو اپنے اصولوں کی خاطر ایک ایسی لڑکی پر حملہ کرتا ہے جو نہتی ہے، جو اکیلی ہے جس کا وارث کوئی نہیں ہے، جس کے پیشے کا ذمہ دار ہمارا سماج ہے، حکومت ہے، موجودہ سامراج ہے۔ تُم ہی بتاؤ ایسے شخص کو کیا سزا ملنی چاہیے۔ طوائفیت کے مسئلے کو حل کرنا، طوائفوں کو گالی دینے سے حل نہ ہوگا بلکہ عورتوں کو تعلیم دینے سے، عورتوں کی بھوک مٹانے سے، عورتوں پر دُنیا کے دروازے کھولنے سے، عورتوں کو کام مہیا کرنے سے، عورتوں کو آزادی دینے سے، عورتوں کے اقتصادی مسئلوں کو حل کرنے سے جب تک یہ کام حکومت نہ کرے گی طوائفیں قائم

رہیں گی۔ اور آج کے دن تک وہ واقعہ بھول نہیں سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دن اس لڑکی کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی، میری بہن کی بے عزتی کی گئی تھی۔ اس دن میرے دوست نے اس لڑکی کی بے عزتی کر کے ظاہر کر دیا کہ مجھے بھی اس گھر میں نہیں رہنا چاہیئے، ہو سکتا ہے کہ میں بھی اسی طرح اس گھر سے نکالا جاؤں۔ اس لڑکی نے جن قہر آلودہ نظروں سے میرے دوست کی طرف دیکھا تھا اس سے صاف یہی عیاں تھا کہ اگر وہ مرد ہوتی تو اسے تھپڑ مار کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتی۔ وہ کون شخص ہو گا، جو اچھی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ آخر اس کو کیا غرض تھی کہ وہ اپنا جسم راہ گیروں کے ہاتھ بیچتی پھرے؟ کیا اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ تمنا نہ تھی کہ اسے ایک ایسا شوہر ملے جو خوب صورت ہو، نیک ہو، اچھے پیسے کماتا ہو اور اس سے محبت کرتا ہو۔ اور اگر زندگی میں یہ چیزیں نہ ہوں، اور بھوک اور فاقوں سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو فروخت کرنا پڑے تو اس لڑکی کا کیا قصور ــــ؟ وہ اداس شام میں کبھی نہیں بھول سکتا، وہ گالیاں ابھی تک میرے ذہن پر مرتسم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر گالی میرے سینے میں ایک زخم پیدا کر گئی ہے۔ اس دن کے بعد میں اپنے دوست کے گھر سے چلا آیا۔

آج کل ماہم میں رہتا ہوں، سمر سٹ ماہم نہیں، منٹو کا ماہم نہیں بلکہ شیواجی پارک سے ایک اسٹیشن آگے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے، اس جگہ نے میری اداسی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ میرے گھر کے سامنے ناریل کے درخت استادہ ہیں، یہ درخت ہوا میں جھومتے ہیں اور سمندر کی ہوا ناریل کے پتوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ آسمان ابر آلود رہتا ہے اور کبھی کبھی خوب زور سے بارش ہوتی ہے، میں اکثر بالکونی میں کھڑا رہتا ہوں اور ایک بھٹکے ہوئے انسان کی طرح ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہوں، لوگ میری طرف دیکھتے ہیں اور ضرور سوچتے ہوں گے کہ یہ شخص یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے، کیا یہ پاگل ہے، کیا اس کا دماغ ٹھیک ہے اور میں ان کی طرف دیکھتا ہوں جیسے میں اُن کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، جیسے میں ان کے دل کی ویرانی، اُن کی بے بسی، اُن کی ناچاری سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ مگر میں نے انھیں بنانے

کی کبھی کوشش نہیں کی۔

میرے مکان کے سامنے ایک ایکٹر کا مکان ہے میں نے اکثر ایک خوبصورت لڑکی کو اس کے کمروں میں گھومتے دیکھا ہے، سُنا گیا ہے کہ یہ لڑکی EXTRA کا کام کرتی تھی، پھر اس ایکٹر نے یہ لڑکی پسند کرلی، اور اب وہ گھر کی چار دیواری میں بند کردی گئی ہے۔ بمبئی میں عام طور پر لوگ ایکٹرسوں سے شادیاں کرلیتے ہیں، اور جب شادی کرلیتے ہیں تو اپنی بیویوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کردیتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر لڑکیوں نے آزاد زندگی بسر کی ہوتی ہے۔ کہاں وہ پہلے کھلم کھلا ہر مرد سے مل سکتی تھیں، لیکن اب وہ کسی غیر مرد کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتیں۔ یعنی ایک انتہا سے گزر کر دوسری انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔ نتیجۃً بے بسی، یاس، ایک ڈر، جو ہمیشہ ان کے گرد ایک چکر لگاتا رہتا ہے، مبادا ان کے شوہر انھیں کسی غیر مرد سے باتیں کرتے دیکھ لیں اور ان کا پھر وہی حشر ہو جس سے اکتا کر انھوں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ ازدواجی زندگی کے چند سالوں کے بعد انھیں معلوم ہوجاتا ہے کہ اس زندگی میں اتنی ہی وحشت ہے، اتنا ہی زہر ہے، اتنی ہی تلخی ہے، اتنی ہی اُداسی ہے جتنی ان کی پہلی زندگی میں تھی۔ کبھی کبھی ایکٹر کی بیوی میری طرف دیکھتی ہے، آنکھوں میں بے پناہ اداسی ہے، چہرے پر ڈر کے آثار ہیں اور زندگی میں حسرت اور غم کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، ہوا زور زور سے چلتی ہے، ناریل کے پتے ہوا میں ناچتے ہیں، آنکھیں چمکتی ہیں لمحہ بھر کے لئے، اور پھر وہی تاریکی چھا جاتی ہے۔

میرے مکان کے نیچے اکثر گندگی کا انبار لگا رہتا ہے۔ کہتے ہیں بمبئی نہایت صاف جگہ ہے۔ اگر کبھی ماہم آؤ تو تمھیں معلوم ہوجائے گا کہ ماہم لاہور کی طرح گندا شہر ہے۔ مکان کے بائیں طرف دھوبی گھاٹ ہے جہاں دن بھر دھوبی کپڑے دھوتے رہتے ہیں۔ رسیّوں پر طرح طرح کے فراک لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سُرخ فراک دیکھ لو، کسی جوان لڑکی کا ہوگا، اور وہ کشکتا ہوا لمبا فراک، کسی بڑھیا کا ہوگا۔ رنگ برنگ کی ساڑیاں، پاجامے، دھوتیاں، انڈرویئر، چادریں جا بجا لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ گلی کے قریب ہی ایک ناریل کا درخت گرا ہوا ہے، ذرا بچ

کے چلنا، کہیں ٹھوکر نہ لگے، چند دن ہوئے بہت تیز و تند ہوا چلی تھی اور یہ ناریل کا درخت گر گیا تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہو کر تمہیں ایک چھوٹا سا مندر دکھائی دے گا، دراصل یہ مندر نہیں ہے صرف ایک ٹین کی چھت ہے جس کے نیچے ایک مورتی رکھ دی گئی ہے۔ بمبئی میں بہت کم مندر ہیں بہت کم گوردوارے ہیں بہت کم مسجدیں ہیں، ہاں گرجے زیادہ نظر آتے ہیں۔ تو ہاں، شاید ماہم کے ہندوؤں کو مندر کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی، بے چاروں نے اسی ٹین کی چھت کے نیچے مورتی نصب کر دی، عورتیں صبح سویرے آتی ہیں اور پتھر کی پوجا کرتی ہیں۔ چند دن ہوئے ناریل کا درخت اس پتھر پر گرا تھا۔ میرا مطلب ہے اس خدا پر، اس دیوتا پر۔ درخت بھاری تھا۔ دیوتا کچھ نہ کر سکا بچارا اور درخت کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ بیسویں صدی کے خدا بھی بے جان ہیں، جامد ہیں، غیر متحرک ہیں آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے نہیں تو اس بات پر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ ہندو کہہ سکتے تھے کہ مسلمانوں نے جان بوجھ کر درخت گرایا ہے تاکہ ہندوؤں کے پرماتما کی بے عزتی کی جائے۔ آج کل ان مسئلوں کو کون پوچھتا ہے، جب پیٹ بھرا ہوا ہو تو پرماتما یاد نہیں آتا مذہب بچارا ۔۔۔

میرا فلیٹ دوسری منزل پر ہے، اس لئے جب کبھی بالکونی میں کھڑا ہوتا ہوں تو ارد گرد کے مکانوں کو اچھی طرح دیکھ لیتا ہوں۔ میرے فلیٹ کے دائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے۔ گجراتی بچارا بوڑھا ہے، لیکن اس کی بیوی جوان ہے۔ اگر خوب صورت ہوتی تو میں ضرور اس سے رومان لڑاتا میری جمالیاتی حس کی داد دو کہ میں یوں ہی ہر لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا، بچاری نہایت ہی بدصورت عورت ہے۔ کاش اس کے دانت باہر نکلے ہوئے نہ ہوتے تو شاید مجھے پسند آجاتی۔ وہ اکثر پھولوں کا ایک گچھا اپنے جوڑے میں باندھتی ہے۔ یہاں کی عورتوں کو پھولوں سے عشق ہے، معلوم ہوتا ہے عورت جتنی زیادہ بدصورت ہوتی ہے، اتنا ہی وہ پھولوں سے محبت کرتی ہے، یہاں تم ہر لڑکی، ہر عورت کو پھولوں سے لدی ہوئی پاؤ گے، لیکن پھر بھی حسن عنقا ہے۔ حسین عورت بہت مشکل سے دکھائی دیتی ہے، اور پھول لگا کر یہاں کی عورتیں اور بدصورت نظر آتی ہیں، خوب صورتی میں اضافہ

تو ہوتا نہیں، بدصورتی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ بہرحال اس گجراتن کو پھولوں سے ہے۔ بوڑھا گجراتی اکثر باہر رہتا ہے، عورت دن بھر چارپائی پر لیٹی رہتی ہے، بالکل اوندھی تکیئے پر مُنھ رکھ کر ٹانگوں کو دن بھر ہلاتی رہتی ہے۔ آج کل گجراتی نے ایک نوکر رکھ لیا ہے۔ آج میں نے نوکر کو گجراتن کے لبوں کو چُومتے ہوئے دیکھا، پھر دروازے کی چٹخنی بند کر دی گئی، کچھ عرصے تک قہقہوں کی آواز آتی رہی۔ جب شام کے وقت گجراتن باہر نکلی، تو اس کے لبوں پر مُسکراہٹ تھی، آنکھوں میں چمک تھی، جسم میں سے ناریل کی سوندھی سوندھی خوشبو آرہی تھی، آنکھوں میں خوشی کے لاکھوں پھُول کھلے ہوئے تھے، لیکن یہ خوشی جلد ہی فنا ہوگئی، بوڑھے گجراتی کو اس عشق کا علم ہوگیا اور اس نے نوکر کو نکال دیا۔ آج پھر گجراتن کے لب سُوکھے ہوئے تھے، اس کی آنکھوں سے یاس ٹپکتی تھی، اس کی مُسکراہٹ میں اداسی تھی، اس کی باتوں میں غمی کی جھلک تھی۔ اور وہ اب اکثر بستر پر اوندھے مُنھ لیٹی رہتی ہے۔ اور اس کی سڈول پنڈلیاں ہلتی رہتی ہیں۔

تم کہو گے کہ میں محبّت کا قصہ لے بیٹھا، سچ کہوں تو بُرا تو نہ مانو گے، میں ہر طریقے سے کوشش کرتا ہوں کہ عورت کے متعلق کچھ نہ سوچوں، عورت کے متعلق کچھ نہ لکھوں، لیکن ہر بار جب لکھنے لگتا ہوں تو عورت سامنے آجاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید عورت کے بغیر بات پھیکی رہے گی، اچھا آؤ، تمھیں عورت کی دُنیا سے دُور لے چلتا ہوں، میں تمھیں اپنے دوستوں سے متعارف کراتا ہوں۔ جس جگہ میں رہتا ہوں وہ فلیٹ صرف ایک آدمی کے رہنے کے لئے ہے، لیکن آج کل اس فلیٹ میں سات آدمی رہتے ہیں۔

ان سے ملو، یہ ہیں مسٹر چٹرجی۔ یہ بنگال کے ایک دور افتادہ گاؤں سے چل کر بمبئی آئے ہیں۔ وہی تلاشِ روزگار ـــــ یہ کوئی نئی بات نہیں، انگریز اتنی دور سے چل کر آئے ہیں، اور اگر ایک بنگالی نوجوان بمبئی میں اپنی قسمت آزمانے آیا ہے تو اس میں کیا بُرائی ہے۔ چٹرجی کا رنگ سیاہ ہے، جب کبھی وہ سیاہ سوٹ پہنتا ہے اور سگریٹ سُلگا کر دھواں مُنھ سے نکالتا ہے تو بالکل ریل کے انجن کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ عام بنگالیوں کی طرح دُبلا پتلا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ تپ دق کا

مریض ہے، اس کے گال پچکے ہوئے ہیں۔ چہرے پر ہر وقت مُردنی سی چھائی رہتی ہے۔ بازو لمبے اور پتلے، ٹانگیں سوکھی ہوئی، آنکھیں بڑی بڑی سیاہ، مگر بے نور، بے جان، کھوئی کھوئی سی، کسی چیز کی جو یا ایک آنے والے زمانہ کی اُمید پر زندہ۔ وہ زمانہ جب بھوک اور بیکاری مٹ جائے گی، جب دُنیا میں انسانیت کا راج ہوگا، جب ایک نئی زندگی کی صبح ہوگی۔

خیر — چیٹرجی نہایت ہوشیار آدمی ہے، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے، میں نے اسے کبھی بیکار نہیں دیکھا۔ مگر حالت یہ ہے کہ آج تک اسے کوئی روزگار نہیں ملا، وہ بمبئی میں اس لئے آیا تھا کہ وہ ایک کامیاب کیمرہ مین بن سکے۔ اس کا بھائی فوٹو گرافر تھا، اور اس نے بھی فوٹو گرافی کا کام بھائی کی دوکان پر سیکھا تھا۔ وہ اردو اچھی طرح بول سکتا ہے، ہندی بھی جانتا ہے، ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بول لیتا ہے۔ اس کے پاس یونی ورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں لیکن ایک عام گریجویٹ سے بہتر انگریزی بول لیتا ہے۔ ایک بار ایک فلم میں کام ملا تھا، لیکن چند دنوں کے بعد اسے نکال دیا گیا تھا۔ اب وہ ڈائرکٹر بننا چاہتا ہے اور اس کے بعد پروڈیوسر۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر بن کر دکھائے گا۔ اس کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے، کبھی کبھی وہ مجھ سے پیسے مانگ لیتا ہے۔ آج کل وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے، اس لئے اس کی صحت روز بروز گر رہی ہے۔ پچھلے ہفتے اس کو زکام ہو گیا اور ساتھ ہی بخار۔ پہلے ہی کون سا طاقتور تھا۔ زکام اور بخار نے اسے اور لاغر کر دیا۔ دو دن تک اس نے کچھ نہیں کھایا۔ اس کی بے نور آنکھیں اندر دھنس چکی ہیں، اس کا چہرہ اور سیاہ ہوگیا ہے، اور جب وہ چلتا ہے تو اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں، باتیں کرتے وقت اس کا سانس پھول جاتا ہے، لیکن اس نے ابھی ہمت نہیں ہاری، وہ اب بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر ضرور بنے گا۔ وہ ایک دن فلم ڈائرکٹ ضرور کرے گا۔ کیا ہوا اگر اس کے پاس پیسہ نہیں ہے، کیا ہوا اگر وہ ایک دن میں ایک بار کھانا کھاتا ہے، وہ فاقے کرے گا۔ وہ زندگی سے لڑے گا، وہ فلمی دُنیا کے ہر شخص سے جنگ کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ کس طرح پروڈیوسر بن جاتے ہیں۔ بمبئی میں اگر کوئی پروڈیوسر بننا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ کسی خاتون کو پھانس لے یا وہ خود اتنا حسین ہو کہ کوئی

عورت اسے پھانس لے لیکن چٹرجی نہ خوبصورت ہے نہ جوان ہے، کوئی ذہین سمجھ دار خوبصورت عورت اس سے عشق نہیں کرسکتی مگر وہ اپنی دُھن کا پکا ہے۔ اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے مگر کبھی کبھی جب وہ بمبئی کے سٹوڈیو کے چکّر لگا لگا کر تھک جاتا ہے تو کہتا ہے کہ وہ اس زندگی سے اُکتا گیا ہے، وہ کب تک جدّوجہد کرتا رہے، وہ کب تک لوگوں کی گھڑکیاں سُنتا رہے اسے لوگوں سے نفرت ہوگئی ہے، اسے خود زندگی سے نفرت ہوگئی ہے، وہ خودکشی کرلے گا۔ اور جب کبھی وہ کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کے متعلق سوچتا ہے تو میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ ایک عجیب انداز سے مُسکراتا ہے، اُف ان خشک لبوں پر ایک بے جان مُسکراہٹ! یہ مُسکراہٹ نہیں خُون ہے، مسلسل فاقوں کی ایک تصویر ہے جو زندہ ہوکر اُس کے لبوں پر ناچتی ہے، کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، بمبئی کا ہر سیٹھ زندہ ہے بمبئی کے ہر ہوٹل میں بجلی کے قمقمے جگمگاتے ہیں، بمبئی کے شراب خانوں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ناچ ہوتے ہیں، نگاہوں میں پیاس اور ہوس کی بجلی کوندتی ہے۔ میرین ڈرائیور پر لاکھوں قمقموں کی روشنی پھیلتی ہے اور ہر طرف پھیلتی چلی جاتی ہے، سمندر کی لہریں بڑھتی ہیں، شور مچاتی ہیں اور کچھ ہٹ جاتی ہیں، ٹراموں، بسوں اور موٹروں کی کھڑکھڑاہٹ مدھم نہیں ہوتی، لیکن یہ شخص اس بے نُور کمرے میں بیٹھ کر کیوں اداس دکھائی دیتا ہے اس کی آنکھوں میں کیوں مرنے کی تمنّا ہے، مگر اس اندھی جدوجہد کا کیا مقصد ہے؟ آج کل چٹرجی کھانستا ہے، وہ ہلکی ہلکی کھانسی، خُدا بچائے اس کھانسی سے۔ کیا اسے تپ دق ہوگیا ہے؟ کیا وہ زندگی میں کبھی ڈائرکٹر نہ بن سکے گا، کیا اس کی خواہش کبھی پروان نہ چڑھے گی؟ میرے دوست اکثر چٹرجی کو چڑاتے ہیں، اس سے مذاق کرتے ہیں کہ وہ کب ڈائرکٹر بنے گا، وہ کب پروڈیوسر بنے گا، پھر سب اسے گالیاں دیتے ہیں، اسے گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں، محض اس لئے کہ اُس کا کوئی وارث نہیں، محض اس لئے کہ اس کے پاس پیسے نہیں اور وہ فلیٹ کا کرایہ ادا نہیں کرسکتا اور وہ اکثر دوستوں کا دست نگر رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اس فلیٹ سے نکال دیا گیا تو کہاں اور کدھر جائے گا۔ وہ کس جگہ رات بسر کرے گا۔ وہ غصّے میں آکر خط لکھنے لگتا ہے کس کو؟ شاید اپنے باپ کو ـــــ جس نے اسے پیدا کیا، شاید اپنی ماں کو جو کب کی مرچکی ہے، یا اپنے

بھائی کو، جو ایک دور اُفتادہ گاؤں میں زندگی کے دن کاٹ رہا ہے، خط لکھو، لکھے جاؤ، دُنیا کے ناخداؤں کو خط لکھو، چرچل کو خط لکھو، روزویلٹ کو تار دو کہ وہ تمھیں روپے بھیجیں۔ سٹالن کو خط لکھو، جس نے ہندوستان کی آزادی کے متعلق کبھی کچھ نہیں کہا۔ دُنیا کے ہر بڑے انسان کو خط لکھو کہ وہ تمھیں اس زندگی سے نجات دلائے۔ تُم دُنیا کے ہر بڑے شخص سے پُوچھو کہ تُم چیڑجی کیوں اس دُنیا میں اکیلے ہو، تُم کیوں فاقے کرتے ہو، تُم کیوں بھُوکے رہتے ہو، تمھیں کیوں سونے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ لیکن خُدا کے لئے خاموش نہ رہو۔ تُم دوستوں کی گالیاں اس خاموشی سے نہ سُنو۔ تُم کیوں اس ذلّت کو برداشت کرتے ہو۔ یہ ذلّت مجھے ناگوار معلُوم ہوتی ہے، ناگوار ہی نہیں بلکہ ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ میرا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ میں یہ سکوت برداشت نہیں کرسکتا ___ اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں ان سب لوگوں کو بالکونی سے نیچے پھینک دوں، دُنیا میں ہر شخص کمینہ ہے، رزیل ہے ......

دُنیا میں ایسے نظام کی ضرورت ہے، ٹھہرو ___ میں اشتراکی بننا نہیں چاہتا۔ میں فسطائیت کا حامی نہیں، میں کسی ازم کا پرچار کرنا نہیں چاہتا، میں فسطائیت کا حامی نہیں۔ میں کہانی نہیں لکھ رہا ہوں، میں کہانی لکھنا جانتا ہی نہیں۔ میری کہانی میں نہ پلاٹ ہوتا ہے اور نہ میں ماحول تعمیر کرتا ہوں، نہ کردار نگاری کے معجزے دکھاتا ہوں۔ نہ رنگین عبارت لکھتا ہے۔ میں اُردو ادب کی خدمت نہیں کرنا چاہتا، میں لفظ 'خدمت' سے نفرت کرتا ہوں۔ میں غلط زبان لکھتا ہوں، میں غلط محاورے لکھتا ہوں، مجھے مذکر اور مونث کی کوئی تمیز نہیں، میں نئی نئی تشبیہیں نہیں لکھتا۔ میں دلکش سٹائل کا مالک نہیں، میں مولیساں اور ٹالسٹائی کی طرح بڑا ادیب بننا نہیں چاہتا، میں شہرت کا قائل نہیں ___ میرے پاس اس وقت صرف چار آنے ہیں صرف چار آنے ___ میں جو کچھ کہوں گا، صاف صاف کہوں گا۔ میرے خیالات ایک فرد، ایک قوم کے نہیں بلکہ انسانیت کے ترجمان ہیں۔ میں انسانیت کا قائل ہوں اور اس لئے پوچھتا ہوں کہ اس دُنیا میں اتنا ظُلم کیوں ہے، اتنی بے کاری کیوں ہے۔ اس کا جواب تُم کیا دو گے! انسانی خُداؤں اور رہنماؤں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ خیر ___ ان سے ملو! اِن کا نام ہری چند ہے، یُوپی ان کا دیس ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہری چند اپنے

مالدار چچا کے ساتھ سٹہ کھیلتا تھا لیکن جونہی جنگ شروع ہوئی، اس کا چچا سٹے میں سب کچھ ہار گیا اور
ہری چند کو نوکری کی تلاش میں بمبئی آنا پڑا کچھ عرصہ وہ ڈپو میں کام کرتا رہا لیکن ڈپو کی نوکری موافق نہ آئی نوکری چھوڑ
دی۔ کسی نے کہا تم ایکٹر بن سکتے ہو بس پھر کیا تھا، ایکٹر بننے کا جنون سر پر سوار ہو گیا۔ بمبئی کی آدھی آبادی
ایکٹر بننے کی تمنا کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ بچارے ہری کو بھی یہی جنون سوار ہے کاش اسے اصلیت
سے آگاہ کر دیا جاتا۔ مگر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے، وہ اصلیت کا کبھی سامنا کرنا نہیں
چاہتا۔ آج کل ہری دن میں دس بیس بار کنگھی کرتا ہے، آئینہ ہر وقت اس کے ہاتھ میں رہتا ہے،
اس کے جسم کی تشکیل میں ایک عجیب نسوانیت کی سی جھلک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مرد
کم ہے اور عورت زیادہ ہے۔ وہ بال عجیب انداز سے بناتا ہے۔ غسل خانے میں دو دو گھنٹے صرف کرتا
ہے۔ اور جب نہا کر باہر نکلتا ہے تو کریم اور پاؤڈر کی آفت آتی ہے۔ چہرے پر کریم ملتا ہے، اور
ملتا رہتا ہے اور پھر پنکھے سے ہوا کرتا ہے تاکہ چہرے کی جلد کے ہر مسام میں کریم جذب ہو جائے
لیکن کریم کے متواتر استعمال سے ابھی تک رنگت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہری ہر روز دگنی اجرت پر
کپڑے دھلاتا ہے اور روپے گھر سے منگوا کر گذارہ کرتا ہے لیکن کب تک۔ وہ پھر سٹہ کھیلنا چاہتا ہے۔
وہ کہتا ہے کہ سرکاری نوکری کر کے کوئی انسان امیر نہیں بن سکتا۔ وہ ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہے،
وہ ریڈیو خریدنا چاہتا ہے۔ وہ خوبصورت عورتوں سے محبت کرنا چاہتا ہے۔ بتاؤ ان باتوں میں کون سی
بری بات ہے۔ ہر عقل مند شخص ان ہی باتوں کی خواہش کرے گا۔ ہری چند جانتا ہے کہ ڈپو کی نوکری
کر کے وہ یہ چیزیں حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے وہ ایکٹر بننا چاہتا ہے، کیوں کہ ایک ایکٹر آج کل ہزاروں
روپے کماتا ہے۔ وہ سٹہ کھیلنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ سٹہ کھیلنے سے یا وہ امیر بن جائے گا یا محض بھکاری
صاف ظاہر ہے کہ وہ زندگی سے جوا کھیلنا چاہتا ہے ـــــ جن حالات، جس ماحول میں وہ رہتا ہے
اس ماحول میں اسے رتی بھر خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ روز بروز اس کا وزن کم ہو رہا ہے۔ سر کے بال
گر رہے ہیں، آنکھوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہیں، وہ کچھ تھکا تھکا سا دکھائی دیتا ہے۔ آج ہری طاقت
کی دوا خرید کر لایا ہے، وہ ہر روز اسے استعمال کرے گا اور زندگی کی کشمکش جاری رکھے گا۔

دواؤں کے استعمال سے انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے، آخر کب تک ـــــ ؟ جس ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا ہے، وہاں کی خوراک میں غذائیت کا نام نہیں، صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسلسل مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ پھر سے ڈپو کی نوکری کر لے، مگر وہ ہمیشہ نفی میں جواب دیتا ہے، اور آئینہ کو سامنے رکھ کر مسکراتا ہے اور اپنے بے جان کھردرے بالوں میں کنگھی کرتا ہے، اور زور زور سے کریم ملتا ہے، اور پھر کہتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ شام کے وقت میری ٹانگیں ڈگمگاتی ہیں، سر چکراتا ہے اور ہر روز رات کو بخار ہو جاتا ہے اور پھر ہلکی ہلکی کھانسی کی شکایت بھی ہے مجھے، لیکن میں ڈپو کی نوکری نہیں کر سکتا وہ بامشقت قید ہے۔ میں یہ قید برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو، اس ٹرنک میں میری بی اے کی ڈگری ہے۔ اگر میں مر گیا" وہ پھر ہنستا ہے۔ موٹے موٹے لبوں پر ایک کھسیانی سی ہنسی، جیسے وہ کبھی نہیں مرے گا۔" تو یہ ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی کو واپس بھیج دینا۔ زیادہ عرصہ اسے اپنے پاس نہ رکھنا۔ ڈگری کا کافی حصہ دیمک چاٹ گئی ہے، اور باقی ـــ ہے بھی کیا۔

اور میں اسے سمجھاتا ہوں کہ بھائی نوکری کر لو لیکن وہ بالکل نہیں مانتا۔ اس دورِ ابتلا میں عجیب انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی ہے، اور ہر شخص ایک بہتر زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہے، مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کے انسانوں کی قسمت ہے، وہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہرت عزت اور رتبے کو برقرار رکھنے کے لئے اسی راستے پر گامزن رہنا چاہتے ہیں جس پر چل کر کئی صدیوں تک ان کے باپ دادا نے حکومت کی تھی۔

اور رگھبیر سے تعارف کرانا تو میں بھول ہی گیا۔ رگھبیر تمام دن باہر رہتا ہے، اور تقریباً رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے، تم پوچھو گے کہ وہ کیا کرتا ہے، تو میں اس کا جواب کچھ نہیں دے سکتا۔ اس فلیٹ میں جو شخص بھی رہتا ہے، اس کے متعلق میں یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے، دراصل اس فلیٹ میں جو لوگ بستے ہیں، وہ کچھ کام نہیں کرتے ـــ اوتار سنگھ کو چھوڑ کر، لیکن اس کا ذکر میں پھر کروں گا۔

رگھبیر کو تم نے نہیں دیکھا، وہ چھوٹا سا قد دور سے دیکھو، ایک خوبصورت کھلونے کی طرح دکھائی دے گا۔ اس کے بال بھورے، رنگ گورا، اس کی خوب صورتی اس کے سنہرے بالوں میں پنہاں ہے۔ اُسے اچھے کپڑے پہننے کا بہت شوق ہے اور جب کبھی وہ ایک اچھا سوٹ پہن کر اور نکٹائی لگا کر فلیٹ سے باہر نکلتا ہے تو گلی کی تمام جوان لڑکیاں اس کی طرف آرزومند نگاہوں سے دیکھتی ہیں، اور پھر رگھبیر ایک شعر گنگناتا ہے :"زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں"۔ رگھبیر شاعر ہے لیکن اس کی کوئی نظم کبھی کسی رسالے میں نہیں چھپی، وہ ایک کامیاب ایکٹر ہے لیکن کسی فلم میں ابھی تک اُسے کوئی پارٹ نہیں ملا۔ وہ ایک دلچسپ عاشق ہے۔ وہ ہر عورت سے عشق کر سکتا ہے، بلکہ وہ لڑکی سے عشق کرتا ہے، سڑک پر چلتے پھرتے ٹرام میں چڑھتے اُترتے، گلی کے موڑ پر، ہوٹل، سینما، باغ، اسٹیشن ہر جگہ وہ لڑکیوں سے عشق کرتا ہے، وہ صرف لڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور پھر آہ بھرتا ہے، شعر کہتا ہے۔ "زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں"۔ اپنی ناکام محبت کے افسانے دوستوں کو سُناتا ہے، جس لڑکی سے وہ عشق کرتا ہے، اس سے ضرور شادی کا وعدہ کرتا ہے، چند دنوں کے بعد عشق کا جوش سرد پڑجاتا ہے، مگر رگھبیر کی جنوں پرور نگاہیں کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔

آج کل اسے ایک بنگالن سے عشق ہو گیا ہے، رگھبیر کہتا ہے کہ وہ واقعی عشق کر رہا ہے، لیکن ہمیں یقین نہیں آتا، ہم سب ہنس پڑے۔ ہم اس کی گہرائی اچھی طرح جانتے ہیں ہر روز وہ اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے، اور وہ رات بھر جاگتا رہتا ہے، میں اکثر رگھبیر کی محبت کا مذاق اُڑاتا ہوں، لیکن وہ مُسکرا کر ٹال دیتا ہے اور کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ اس کی ہنسی میں واقعی کچھ مایوسی سی آگئی ہے۔ کیا رگھبیر بنگالن سے عشق کرتا ہے؟ رگھبیر نے بتایا کہ شروع میں بنگالن، جس کا نام گیتا ہے اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی، گیتا ایک نرتکی ہے وہ ایک مشہور فلم اسٹار کے ٹروپ میں کام کرتی ہے اور بچارا رگھبیر بھی اس ٹروپ میں شامل ہو گیا اور اس بنگالن کی خاطر تمام ہندوستان کا چکر لگاتا رہا۔ لیکن جب ٹروپ کلکتہ پہنچا تو گیتا نے صاف جواب دے دیا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ شاید گیتا کے چاہنے والوں نے اصرار کیا ہوگا کہ وہ کیوں ایک غریب

آوارہ لونڈے سے عشق کر رہی ہے ۔ ہماری طرف دیکھو، ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھو، ان کاروں اور گاڑیوں کی طرف دیکھو، یہ چمکتے ہوئے ہیرے، یہ صوفہ سیٹ، یہ رنگین پردے، یہ نوکر، یہ لونڈیاں یہ باندیاں، اور طرح طرح کے کھانے ـــ وہ شاعر تمہیں کیا دے گا، فقط چند شعر، اور کچھ نہیں، اگر تم اس سے شادی کرو گی تو بھوکی مرجاؤں گی۔ وہ خود بھوکا ہے، وہ تمہیں کیا کھلائے گا، اور پھر وہ بنگالی نہیں ہے، شمالی ہند کی ایک گھٹیا سی ریاست کا باشندہ ہے، اپنے دیس میں رہو، اس کلکتہ میں رہو، یہاں ناچو، گاؤ، لوگوں کو اُلو بناؤ اور زندگی کے دن ہنسی خوشی ..... بسر کرتی چلی جاؤ ـــ اور بے چارا رگھبیر، جب سے وہ کلکتہ سے واپس آیا ہے، اُس کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ عورت کی بے وفائی نے اُسے بُری طرح اُداس کر دیا ہے۔ اب وہ ہر روز شراب پیتا ہے اور رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے پہلے وہ اپنے مستقبل کے متعلق بہت پُر امید تھا لیکن اب اس کے حوصلے بہت پست ہو گئے ہیں۔ اس کے دل کی ویرانی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آج وہ رات کے بارہ بجے گھر واپس آیا۔ اُس نے کافی شراب پی رکھی تھی، اور اس کے مُنہ سے شراب کی بو آ رہی تھی اس کے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے، اس کی پینٹ میلی اور ڈھیلی ہو گئی تھی۔ کوٹ پر دھبے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں سُرخ تھیں، وہ ہنسنا چاہتا تھا، لیکن ہنسی لبوں کے قریب ہی رُک گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کُرسی پر گر گیا اور بڑبڑانے لگا۔ یہی کہ وہ بمبئی میں نہیں رہ سکتا، وہ واپس شملہ جائے گا، اُسے کیا معلوم کہ شہری لڑکیاں اتنی چالاک ہوتی ہیں۔ اُس نے بُوٹ اُتار دیئے اور پسینے سے بھیگی ہوئی جرابوں کو سُونگھنے لگا، اور پھر جرابوں کو اس نے ایک کونے میں پھینک دیا۔ وہ شملہ کی حسین وادی میں اپنا مسکن بنائے گا، وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ شملہ کی ایک انجان اُلھڑ لڑکی سے شادی کرے گا اور نمک اور تیل کی دوکان کھولے گا۔ اب رگھبیر نے ایک کوٹ اُتار دیا تھا، قمیص اُتارتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا، اسے فلمی دُنیا سے نفرت ہو گئی ہے، اور پھر اس نے پتلون بھی اُتار دی اور صرف انڈر ویئر پہنے کُرسی پر ڈھیر ہو گیا ـــ اسے اس زندگی سے نفرت ہو گئی ہے، وہ زندگی کو دوبارہ شملہ میں زندۂ جاوید کرے گا۔ وہ شملہ کی پہاڑیوں کو کبھی بھول نہیں سکتا اور پہاڑوں

پر پھیلی ہوئی دُھند سفید، ٹھنڈی، نرم و نازک، اور اس کے ذہن میں اُس اُلھڑ لڑکی کے نقوش اُبھر آئے جس نے اُسے شہر جانے سے روکا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور دُھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، اور وہ دونوں دُھند میں اڑے جا رہے تھے۔ کدھر، کہاں۔ رگھبیر نے لڑکی کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ لڑکی کی چھاتیاں اس کے سینے سے ٹکرائیں اور ایک غیر فانی نغمہ پیدا کرتی گئیں لڑکی کے دل کا طوفان اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور دھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن وہ کیا کرتا۔ اُس نے لڑکی کے گرم جلتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ دیئے۔ اور وہ دھند کی انتہائی گہرائیوں میں کھو گیا وہ نرم نرم پتلے پتلے ہونٹوں کا مزہ۔ وہ لڑکی کے سینے کا طوفان، اس کی آنکھوں کی عاجزی، رگھبیر کبھی نہیں فراموش کر سکتا۔ رگھبیر لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا آیا، اور اب وہ پھر واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا وہ لڑکی اب بھی انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان ابدی بوسوں کا مزہ ابھی تک لڑکی کے ہونٹوں پر ہو، لیکن ــ کون کہہ سکتا ہے کہ کسی زمیندار نے اس لڑکی سے شادی نہ کر لی ہوگی۔ ایسی حسین لڑکیوں کو کون کنواری رہنے دیتا ہے۔ شہر اور گاؤں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں، دونوں جگہ ظلم ہے۔ ہر جگہ محنت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ظلم و استبداد کی پھیلی ہوئی سیاہی انسانوں کے دلوں کو اور سیاہ کر دیتی ہے۔ رگھبیر نے اب انڈرویئر بھی اُتار دیا ہے اور اب وہ مادرزاد ننگا ہے، اس کا سر ایک طرف لُڑھک گیا ہے اور اس کے مُنہ سے شراب کی بدبو بدستور آرہی ہے۔ باہر ناریل کے درخت پر اُلّو چیخ رہا ہے۔ اور ہوا زور زور سے سائیں سائیں کر رہی ہے۔

بچارا رگھبیر..... اور پھر اوتار سنگھ ـــــ بڑی دلچسپ شخصیت رکھتا ہے۔ اوتار سنگھ ایک سرکاری ڈپو میں نوکر ہے، وہ صبح چھ بجے گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کے آٹھ بجے واپس آتا ہے وہ ایک ایسے ڈپو میں کام کرتا ہے جہاں جتنا زیادہ کام کیا جائے اتنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے، اوتار سنگھ زیادہ سے زیادہ روپے کمانا چاہتا ہے۔ وہ پنجاب کے ایک مالدار جاٹ کا لڑکا ہے۔ اوتار سنگھ کہتا ہے کہ آج کل اُسے ترقی ملنے والی ہے، اور ترقی ملنے کی وجہ صرف اس کے صاف اور سُتھرے کپڑے ہیں اور خاص کر اس کی نیلی نکٹائی جو اس کے سپرنٹنڈنٹ کو بہت پسند ہے۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ

ایک انگریز ہے، دفتر میں باقی کلرک دھوتی پاجامہ پہن کر آتے ہیں، اس لئے وہ زیادہ پسند نہیں کئے جاتے۔ اور چونکہ دفتر میں سردار ہی سب سے زیادہ خوش پوش انسان ہے۔ اس لئے اسے جلد ہی ترقی ملنے والی ہے، اونار سنگھ خدا پر ایمان نہیں رکھتا، وہ گوردوارے نہیں جاتا، اور اکثر قینچی سے داڑھی کے بال بھی کاٹ لیتا ہے۔ مگر سکھوں کے متعلق کوئی ریمارک پاس کیا جائے تو وہ بُرا مانتا ہے۔ وہ سکھوں کے خلاف کوئی بات سُننا پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک مجموعۂ اضداد ہے، اور آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی سخت رجعت پسند ہے۔

آج کل وہ بھی زندگی سے تنگ آگیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فلیٹ کی ہوا میں اُداسی رچ گئی ہے، وہ کہتا ہے کہ اُسے ڈیوٹی کی زندگی پسند نہیں۔ آخر وہ کب تک دن رات کام کرے اور کیوں، ڈیوٹی کی کلرکی انسان کو غلام بنا دیتی ہے۔ اور یہ نوکری کتنی ذلیل ہے۔ اندر جانے کے لئے شناختی کارڈ لانا ضروری ہے، کارڈ دکھا کر اندر جانا پڑتا ہے۔ پھر رجسٹر پر حاضری لگانی پڑتی ہے اور کوئی کلرک ایک دو منٹ دیر سے پہنچے تو اس کی تنخواہ میں سے پیسے کاٹ لئے جاتے ہیں۔ یہ زندگی نہیں دوست، یہ موت ہے۔ اور پھر ان لمحوں میں کبھی خوشی نصیب نہیں ہوتی، کبھی تو انسان جی بھر کر ہنس لے کسی عورت سے مُسکرا کر بات کر لے، اس کے حسین زندہ بالوں سے کھیل لے۔ کبھی تو عورت کے حسین خطوط کی داد دے سکے۔ کبھی تو عورت کی دلفریب مُسکراہٹ سے لُطف اندوز ہو سکے۔ کبھی تو انسان عورت کے جسم کی گرمی، اس کے بالوں کی خوشبو، اس کی آنکھوں کی دل کشی، اس کی باتوں کی موسیقی سے ہمکنار ہو سکے۔ لیکن اس فلیٹ میں عورت کہاں۔

یہاں تو ہم سب بھُوت رہتے ہیں۔ عہد پارینہ کے انسان۔ تُم نے بمبئی آنے کے لئے لکھا ہے، آؤ۔ بڑے شوق سے آؤ اور میرے پاس ٹھہرو، جب اسٹیشن سے اُترو تو بس میں بیٹھ کر شیواجی پارک کا ٹکٹ خرید لو، اور پھر ماہم پوسٹ آفس، ماہم پوسٹ آفس کے سامنے ایک گلی ہے، بس چلے آؤ اس گلی کی طرف، جو دوسرا مکان نظر آئے اس کی طرف نگاہ اُٹھاؤ، آشیانہ بلڈنگ کا نام پڑھ لینا ــــ اور جوں ہی داخل ہو گے، تمہیں ایک پاگل آدمی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

گھبرانا نہیں، یہ پاگل خانہ نہیں، یہاں انسان بستے ہیں۔ یہ پاگل اکثر دروازے کے باہر پڑا رہتا ہے۔
یہ کیا کرتا ہے، روٹی کہاں سے کھاتا ہے؟ اس کا مجھے کوئی علم نہیں، لوگ اسے پاگل کہتے ہیں،
لیکن میں نے کبھی اسے کوئی ایسی حرکت کرتے نہیں دیکھا، جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ یہ شخص پاگل ہے۔
اکثر یہ شخص آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ ایک کالی، سیاہ پھٹی ہوئی قمیص پہنتا ہے، اس کے سر کے بال بکھرے
رہتے ہیں اور ان میں مٹی جمی رہتی ہے۔ مسلسل فاقوں کی وجہ سے یہ انسان بہت دُبلا ہو گیا ہے۔
میں نے اُسے کبھی کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ وہ اکثر خاموش، چُپ چاپ لیٹا رہتا ہے، اور جب
لیٹے رہنے سے تنگ آ جاتا ہے تو گلی میں آ کھڑا ہوتا ہے، اور سر کو جھٹک کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔
یا کبھی پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہے۔ جیسے زندگی کا سرمایا کہیں بھول آیا ہے۔ اُس کے ساتھ تم ایک کُتّے کو
دیکھو گے، کُتّا تمہیں دیکھ کر بھونکے گا۔ کُتّے کو دیکھ کر خوف زدہ نہ ہونا، یہ کُتّا ہر نووارد کو دیکھ کر بھونکتا
ہے، اس کی سُرخ آنکھوں میں تم غم و غُصّہ کی جھلک دیکھو گے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر تم آشیانہ بلڈنگ کے
رہنے والوں کی بھوک کا اندازہ لگا سکو گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کُتّا بھوکا ہے، وہاں کے رہنے
والے خود کتنے بھُوکے ہوں گے۔

نچلی منزل میں ایک میوزک ماسٹر رہتے ہیں۔ اُنھوں نے ایک طوائف کو پھانس رکھا ہے۔
میں نے اس عورت کو اکثر روتے دیکھا ہے۔ اکثر یہ عورت سلاخوں والی کھڑکی میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر
جانے والے لوگوں کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ میوزک
ماسٹر ایسی عورت کہاں سے لے آیا۔ میوزک ماسٹر کی شکل ایک بھٹیارے سے ملتی جُلتی ہے لیکن اس کے
گھر کے باہر ایک موٹر کھڑی رہتی ہے۔ یہ موٹر اکثر خراب ہو جاتی ہے۔ جب رات پڑتی ہے تو میوزک
ماسٹر عورت کو کار میں بٹھا کر کہیں لے جاتا ہے اور رات کے بارہ بجے کے بعد گھر آتا ہے میں نے
دونوں کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ ہر روز کمرے میں سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میوزک
ماسٹر کی بیوی زور زور سے روتی ہے چیختی ہے چلاتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ یہاں سے چلی جائیگی۔
وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔ دونوں خوب زور زور سے باتیں کرتے ہیں، لیکن دوسرے دن دونوں پھر اُسی

کمرے میں رہتے ہیں، سوتے ہیں اور عورت کھڑکی میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف دیکھتی ہے، معلوم نہیں کیوں۔!

اب ذرا سیڑھیاں چڑھو، دیکھ کر چڑھنا، پھسلن ہوگی۔ یہاں ٹھہر جاؤ ذرا دم لے لو۔ ایک ہی بلڈنگ میں تمام ہندوستان کو دیکھ سکو گے۔ یہاں ایک کرسچین لڑکی رہتی ہے۔ یہ لڑکی ہے یا عورت ہے یا ماں یا کسی کی بیوی، اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ کہتے ہیں اس کے تین بچے ہیں۔ یہ تینوں بچے سیڑھیوں میں کھیلا کرتے ہیں۔ بچوں کے جسم پر پھوڑے نکلے ہوئے ہیں۔ کرسچین لڑکی دروازے میں کھڑے ہوکر اپنے بچوں سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔ اس کرسچین لڑکی کا نام کیا ہے۔ نام پوچھنے کی ضرورت کیا ہے۔ بچاری کی حالت ابتر ہے، گو رنگ سفید ہے، لیکن جسم پر گوشت نہیں ہے۔ چہرے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی ہیں، اور اُوپر والے جبڑے کے تین دانت آگے بڑھے ہوئے ہیں کرسچین لڑکی فراک پہنتی ہے، کاش شلوار یا دھوتی پہنا کرے تو کم از کم اس کی پنڈلیاں تو ہماری نظر سے اوجھل رہیں، نہایت پتلی پتلی سی ٹانگیں اور کچھ کچھ مڑی ہوئی، جیسے جسم کے بوجھ سے مڑ گئی ہوں میں نے اس کے خاوند کو کبھی نہیں دیکھا یعنی میں نے اس گھر میں کسی مرد کو نہیں دیکھا۔ بہرحال کوئی مرد تو اس گھر میں آتا ہوگا۔ ورنہ یہ بچے کہاں آگئے۔ اور بچاری کرسچین لڑکی گذارہ کس طرح کرتی ہوگی جب تم پہلی بار آؤ گے تو تم کرسچین لڑکی کو دروازے میں کھڑی پاؤ گے۔ وہ تمھاری طرف دیکھے گی اور پھر مُنہ موڑ لے گی۔ وہ ہر روز کس کا انتظار کرتی ہے، اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اس کے نہ آنے والے محبوب کا انتظار ضرور ہے، وہ کب تک انتظار کرے گی۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس لڑکی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن میں نے ہمیشہ اُسے دروازے پر کھڑی دیکھا ہے۔

کرسچین لڑکی کے دروازے کے سامنے چند مدراسی عورتیں رہتی ہیں، بلکہ ایک بیوہ عورت رہتی ہے، جس کی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ لڑکیاں جوان ہیں۔ لیکن وہ شباب ہی کیا جو نھیں اپنی طرف نہ کھینچ لے، وہ عورت ہی کیا جس کی طرف ایک نظر دیکھنے کو جی نہ چاہے۔ عورت کے حُسن میں

کشش ہونی چاہیئے، اگر تم ایک بار دیکھ لو، تمھیں یہ محسوس ہو جائے کہ تم ایک زندہ، متحرک دائرے
کے اندر کھڑے ہو، لیکن آشیانہ بلڈنگ میں حُسن مُردہ ہے، شباب عنقا ہے، زندگی جامد ہے، میں سمجھتا
ہوں کہ زندگی حُسن سے پیدا ہوتی ہے، خوبصورت چیز کو دیکھ کر خوبصورت بننے کو جی چاہتا ہے، یہاں
تو بدصورتی کا مقابلہ ہے، لڑکیوں کی ماں بیوہ ہے، اور اس نے اپنی بیوگی کے تمام قوانین اپنی لڑکیوں
پر عائد کر رکھے ہیں۔ میں نے لڑکیوں کو کبھی مُسکراتے نہیں دیکھا، اُن کے گھر سے کبھی قہقہوں کی آواز
نہیں آئی، گھر کے دروازے بند رہتے ہیں، اور جب کبھی مدراسن کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، تو
اس میں سے ایک بیوہ کا چہرہ تمھیں ڈھونڈھتا ہے، دو موٹی موٹی آنکھیں لمحہ بھر کے لئے چمکتی ہیں،
پھر ایک جوان سڈول بازو آگے بڑھتا ہے، اور پھر یہ تمام جسم پیچھے حرکت کرتا ہے۔ تم نے بیوہ
کا چہرہ نہیں دیکھا۔ چہرے پر نفرت کی جھریاں ہیں، مٹتے ہوئے شباب کے آخری لمحے، بیوگی کی
تلخیاں، زندگی سے انتہائی نفرت اور ایک نہ مٹنے والی پیاس اور تشنگی کا اظہار، جو اکثر مدراسن کی
آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ صرف مدراسن کی آنکھوں ہی سے نہیں، بلکہ اس کا پَرتَو تم اُن جوان لڑکیوں کی
آنکھوں میں دیکھ سکتے ہو، صرف آنکھوں میں ہی نہیں، بلکہ اس نفرت، اس پیاس، اس بھوک، اس
تشنگی اور بیوگی کی تشکیل تم ان لڑکیوں کے جسموں میں دیکھ سکتے ہو۔ لڑکیاں اکثر خاموش اور اداس
رہتی اور ناریل کے درختوں کی طرف دیکھتی رہتی ہیں۔ ہم سب اپنے کمرے کی چابی ان مدراسنوں کو دے
جاتے ہیں۔ اگر تم ان لڑکیوں کی جنسی بھوک کا اندازہ کرنا چاہو تو تم ایک دن کمرے کی چابی خود انھیں
دینا، تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کمرے کی چابی لینے کے لئے کتنی بے قرار رہتی ہیں۔ دروازہ اکثر
بند رہتا ہے، آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹاؤ، فوراً دروازہ کھُل جائے گا اور ایک بدصورت چہرہ
تمھاری طرف دیکھے گا۔

چہرہ، بالکل بدصورت چہرہ، صاف سلیٹ کی طرح، جذبات سے عاری، نہ ہنسی، نہ خوشی،
نہ غم، نہ زندگی نہ موت، بالکل بے حس، بے جان چہرہ، اور پھر ایک میلا گندا سا ہاتھ تمھاری طرف بڑھے
گا، میری انگلیاں کئی بار غیر ارادی طور پر ان بدنُما انگلیوں سے مس ہوئیں، لیکن ایک بار ایسی دھڑکن پیدا نہ

جو ایک جوان لڑکی کے جسم سے مس ہو کر پیدا ہوتی ہے۔ ان سب لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی ہیں، اُن کے جسم اُن کے چلنے پھرنے کے انداز اُن کے دیکھنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔ وہ تمھاری طرف بار بار دیکھیں گی، لیکن نگاہوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ جوانی میں شکست کا احساس ہو چکا ہے۔ مگر ان لڑکیوں کی تربیت، ان کا ماحول، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک نئی تربیت ایک نئی تشکیل دی جائے تو ممکن ہو سکتا ہے کہ یہی لڑکیاں آفت کا پرکالہ بن جائیں، اور اس سوئی ہوئی زندگی میں شعلہ بن کر چمکیں۔

اگرچہ ان کا رنگ سیاہ ہے، لیکن جوانی کو رنگ سے کیا نسبت۔ دور کیوں جاؤ، ہمارے محلے میں ایک اور لڑکی رہتی ہے جس کا رنگ بالکل ان مدراسیوں سے ملتا ہے، مگر اس کے حُسن میں کتنی کشش ہے، کتنی جاذبیت ہے، اس کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ یہ لڑکی اکثر سفید ساڑھی پہنتی ہے، سیاہ رنگ اور سفید ساڑھی، سفید ساڑھی اور سیاہ رنگ ــــ، سیاہ رنگ سفید ساڑھی میں خوب چمکتا ہے، خوب پھبتا ہے۔ لڑکی کو ساڑھی پہننے کا طریقہ خوب آتا ہے۔ جسم کا ہر خط اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ لڑکی کو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی ایک مصوّر ہے جو ساڑھی کو مصوّر کے برُش کی طرح استعمال کر سکتی ہے۔ ایک ہلکا سا جھٹکا، کہ انسانی جسم نے ایک نئی طرز اختیار کی۔ وہ ہر روز ساڑھی بدلتی ہے، کبھی کبھی آسمانی جیسے ناریل کے سبز پتے، کبھی کبھی سُرخ جیسے شفق کی لالی، سُرمئی، مٹیالا رنگ بدلتے ہیں، حُسن بدلتا ہے، جوانی بدلتی ہے، ہر چیز بدل جاتی ہے، لیکن لڑکی کا حُسن اسی طرح قائم ہے۔ آؤ، میرے قریب آؤ۔ وہی لڑکی آرہی ہے، لو وہ آرہی ہے اور آشیانہ بلڈنگ کے سکنڈ فلور کے رہنے والے بالکونی میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کے ہر قدم کی آواز اُن کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ دُور کبوتر ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔ ناریل کے پتے ہوا میں جھومتے ہیں، سورج کی سنہری کرنیں بالکونی پہ ناچتی ہیں، نگاہیں لڑکی کی طرف لپکتی ہیں۔ ساڑھی جسم سے چپکی ہوئی ہے۔ جسم کا ہر خط واضح ہے۔ پنڈلیوں سے اُوپر رانوں تک اور پھر کولھوں کا سنگم۔ کتنا دلفریب، کتنا دل کش ہے، مصوّر کو داد دو، اس کی حنائی انگلیوں کو چُوم

لو۔ اگر چوم سکتے ہو۔ نظر کمر تک جاتی ہے، کمر پر زیادہ گوشت نہیں، اور پھر سینے کا پھیلاؤ، چھاتیوں کا زیر و بم ــــ، اور سمندر لہریں مار رہا ہے، لہریں آتی ہیں، ساحل سے ٹکراتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں، اور اُوپر ــــ ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ، چھوٹے چھوٹے پتلے ہونٹ اور کسی کی زبان اُن پتلے ہونٹوں پر پھرتی ہوئی، نچلا ہونٹ کچھ کھنچا ہوا، آنکھیں سیاہ، پلکیں جوانی کے بوجھ سے جھکی ہوئی۔ یہ جانتے ہوئے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں، لڑکی شرماتی نہیں، آنکھوں میں مستی ہے، کامرانی ہے۔ لڑکی کو احساس ہے کہ وہ اپنے حُسن سے لوگوں کو مسحور کر سکتی ہے۔ کتنا صحت منداحساس ہے، وہ آگے بڑھتی ہے، ہری چند اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک آہ بھرتا ہے اور کہتا ہے، مار ڈالا۔ مار ڈالا۔ ہائے مار ڈالا۔ اور چٹرجی کی ہنسی جیسے مُردہ زندہ ہوگیا۔ اور اوتار سنگھ کا جُھک کر دیکھنا اور رگھبیر کا شعر پڑھنا۔ زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" اور پھر سب کا پیچھے ہٹ جانا اور کرسیوں پر بیٹھ کر گالیاں بکنا۔ خُدا کو تہذیب کو ــــ، سرمایہ داروں کو، حکومت کو، ماں باپ کو، سب کو۔ رگھبیر کا عریاں ہو کر کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر لگانا، چٹرجی کا کرسی میں دھنس جانا، اوتار سنگھ کا اپنی پگڑی اُتارنا اور لمبے لمبے بدبُودار بالوں میں کنگھی کرنا ــــ اور میرا لڑکی کی طرف دیکھتے رہنا ــــ دیکھتے رہنا ــــ یہاں تک کہ حُسن نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ شباب کی خوشبو ہوا میں گُم ہو جاتی ہے، اور کسی کے قدموں کی مدھم چاپ آہستہ آہستہ خاموش ہوتی جاتی ہے ــــ اور صرف گالیوں کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح دماغ سے ٹکراتی رہتی ہے، ابے او حرامزادے، اَبے او اُلّو کے پٹھے ....

☆

دی بلیو پرنٹ

ڈیر ایڈیٹر!

۲۲ر ستمبر ۱۹۴۹ء

میں آپ کو ایک افسانہ کا مواد بھیج رہا ہوں، مجھے کاغذ کے یہ چند اوراق کہاں سے ملے۔ ان کا میں بعد میں ذکر کروں گا۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں افسانہ نگار نہیں ہوں۔ ایک دفتر میں ایک معمولی سا کلرک ہوں۔ اس دفتر میں کلرکی کرتے ہوئے تیس برس گزر گئے ہیں۔ میری ایک بیوی ہے اور بدقسمتی سے میرے چھ بچے ہیں۔ میری تنخواہ اس وقت ایک سو بیس روپے ہے۔ پینتالیس روپے پر نوکر ہوا تھا۔ آج سے بیس سال پہلے۔ میرے دل میں تمنائیں تھیں۔ آگے بڑھنے کی آرزو تھی۔ ایک خوبصورت، صاف ستھرا گھر بنانے کی خواہش تھی۔ اسی جوش میں آکر شادی کرلی تھی۔ انھیں آرزوؤں کو پروان چڑھانے میں بیس برس گزر گئے اور میری حالت پہلے سے بھی ابتر ہوتی گئی۔ اور اب میں قبل از وقت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ سر کے بال سفید ہو گئے ہیں، میری آرزوئیں بھی اب بوڑھی ہو گئی ہیں۔ جس کھولی میں میں رہتا ہوں وہاں نہ نل ہے نہ بجلی۔ رات کو Kerosene Oil کا لیمپ جلاتا ہوں اور دن میں سورج کی روشنی میں چلتا پھرتا ہوں۔ یہ مواد میں آپ کو کیوں بھیج رہا ہوں۔ اس کے بھیجنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس شخص کی تمنائیں، آرزوئیں میری طرح کی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی

بنایا ہوا تھا۔ اور میں نے بھی۔ مجھے یہ شخص آرٹسٹ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن شاید Blue Print زندگی نے ساتھ نہ دیا۔ حالات نے اسے موت کے مُنہ میں جا دھکیلا۔

یہ اس بھیانک رات کی بات ہے جب اس شہر میں ایک زبردست طوفان آیا تھا۔ رات کا وقت تھا کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا۔ میری بیوی جاگ رہی تھی اور میرے بچے رو رہے تھے۔ کچھ خوف کی وجہ سے اور کچھ بھوک سے، ہیں، ہیں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کالا کلوٹا آدمی نظر آیا۔ اس نے مجھے باہر آنے کے لئے کہا۔ اور میں چپکے سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ جب ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر لیا، تو اس نے مجھے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ اور ہم دونوں اس جھونپڑی کے اندر چلے گئے اور باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہوا تیز اور تند تھی اور اندر چارپائی پہ ایک شخص لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے ایک لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر لیٹے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ سویا ہوا ہے۔ میں نے جگانے کی کوشش کی لیکن ساتھ والے آدمی نے اشارے سے کہا کہ وہ ہمیشہ کے لئے سو گیا ہے۔ سونے والے کے دونوں ہاتھوں میں چند اوراق تھے جو اس نے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا رکھے تھے، جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میں نے خود بھی ان کو پڑھ لیا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ پڑھیں میں نے وہ کاغذات لے لئے اور لاش پر چادر ڈال دی۔ چھت ٹپک رہی تھی۔ کمرے میں ایک چارپائی تھی، سرہانے کے قریب ایک ٹرنک تھا۔ دیواروں پر غالب، ٹیگور اور پریم چند کی تصویریں تھیں، جو کافی گندی اور میلی ہو گئی تھیں۔ یہ شخص کس طرح مرا، کیوں مرا، اس کی عمر کتنی تھی؟ غالباً مرنے والے کی عمر زیادہ نہ تھی۔ شاید پینتیس سے اُوپر نہ ہوگا۔ لیکن چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کافی لاغر اور کمزور تھا۔ میں نے وہ کاغذات اُٹھا لئے اور صبح میونسپلٹی کو اطلاع دیدی —— اور آج میں آپ کو یہ اوراق بھیج رہا ہوں۔ کاش میں افسانہ نگار ہوتا تو ان واقعات کو سامنے رکھ ایک افسانہ لکھتا اور لوگوں کو بتاتا کہ اس زندگی میں تمنائیں کس طرح کچلی جاتی ہیں اور آرزوئیں بھوتوں کا رُوپ دھار کر بڑھاپے میں زندگی حرام کرتی ہیں:-

ذرا ٹھہر جائیے - میرا بچہ رو رہا ہے - اسے خسرہ نکل آیا ہے - بیوی راشن لانے کے لئے دوکان پر گئی ہوئی ہے - اس لئے میں بچے کو پہلے دودھ پلا آؤں - پھر خط ختم کروں گا -

۲۳ر ستمبر ۱۹۴۹ء

اس دن میں خط ختم نہ کرسکا، بچہ متواتر روتا رہا - میں ڈاکٹر کے پاس گیا - وہاں سے دوائی لایا اتنے عرصے میں معلوم ہوا کہ باقی بچوں کے بھی خسرہ نکل آیا ہے - یہ کوئی چھوت چھات کی بیماری ہے - بچوں کو بخار تیز ہے - اگر آپ نے شادی کی ہوئی ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ چھ بچوں کے باپ کی کیا حالت ہو سکتی ہے -

وہ اوراق میں نہیں بھیج رہا ہوں، ان کی نقل بھیج رہا ہوں - ممکن ہے آپ کو مواد پسند آئے یا نہ آئے - آپ اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیں - آپ کوئی شاید جنسی افسانہ چھاپنا پسند کریں یا بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے افسانے چھاپیں - اسی لئے میں ان اوراق کی ایک نقل بھیج رہا ہوں ـــــ تین چار جگہ میں نے چند لفظوں کا ردوبدل کیا ہے - اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان الفاظ کو رکھیئے گا، ورنہ آپ انہیں کاٹ سکتے ہیں ؛؛

The Blue Print

خواب گاہ :-

دیواروں پر گہرا آسمانی رنگ، تین دیواروں پر نیچے سے دیوار کی تقریباً دو تہائی اونچائی چھوڑ کر گز بھر کی شفق رنگ کی ایک پٹی، جس پر نگاہِ محبوب کی طرح جھکی جھکی ڈالیاں منقش ہوں اور سامنے والی دیوار پر صرف شفق رنگ کی پٹی جس کے وسط میں سورج آدھا نیچے نیلے رنگ کے سمندر میں ڈوبا ہوا نظر آئے - اس پٹی کی صرف نچلی لائن چاروں طرف دیواروں پر واضح ہوگی - اوپر کی نہیں - کیوں کہ اوپر کا نیلا رنگ آسمان کو ظاہر کرے گا جس میں شفق آسمان کے رنگ میں کھوئی ہوئی نظر آئے -

کمرے میں نیلی روشنی کا بلب ایک خوب صورت شیڈ کے ساتھ اور فرش پر دری،

دری پر شفق رنگ کا قالین ۔

ایک طرف پلنگ بچھا ہوا۔ پلنگ کے ایک طرف ایک نازک سی میز پر ایک پیاری سی بلور کی طشتری میں موتیا، زرد یا سفید چمپیلی یا مولسری کے پھول (جس کا بھی موسم ہو) ساتھ میں پانی کا ایک گلاس طشتری سے ڈھکا ہوا۔ اور ایک کتاب مطالعہ کے لئے رکھی ہوئی۔ پلنگ کے دوسری طرف ایک چوڑی سی میز پر ریڈیو رکھا ہوا سرہانے کے اتنے قریب کہ سوتے وقت ہاتھ بڑھا کے بند کیا جا سکے۔ ریڈیو پر لسنر پڑا ہو۔!

سرہانے سے گز بھر کی اونچائی پر دیوار میں ایک اور بجلی کا خوبصورت سا لیمپ لگا ہوا جو پلنگ پر جھکا ہوا ہو۔ لیمپ میں بھی نیلا بلب ہو، جس کا ہولڈر تکیئے کے نیچے رکھا ہو تاکہ سوتے وقت ہاتھ بڑھانے کی بھی زحمت نہ کرنی پڑے۔

کمرے کے ایک کونے میں ایک طرف Latest ڈیزائن کا وارڈ روب، اور ایک طویل شو ہنگر۔

دوسرے کونے میں ایک جدید ترین وضع کی بڑی سنگار میز۔ اس پر سنگار کا سامان سجا ہوا۔ اور پاس ہی ایک ماڈل ہنگر۔

چوتھے کونے میں یعنی پلنگ کے متوازی لکھنے کی میز اور ایک آرام کرسی، میز کے اوپر دیوار میں ایک چھوٹا بک شلف چڑھا ہوا جس کے پٹ شیشے کے ہوں۔ تاکہ ان میں رکھی ہوئی گنتی کی چند تازہ ترین کتابوں کے گرد پوشوں پر نام پڑھے جا سکیں، اور کسی کتاب کے ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو۔

میز پر ماہوار رسالے انگریزی اور اردو زبانوں کے رکھے ہوئے، اور ایک گھڑی اور لکھنے کا سامان قرینے سے سجا ہوا۔ اور ایک الیکٹرک لیمپ نیلے بلب کا ایک نازک سے شیڈ کے ساتھ میز پر جھکا ہوا۔

بک شلف کے اوپر اور شفق رنگ کی پٹی کے نیچے چند ملکی رہنماؤں کی تصویریں لگی ہوں۔

میز پر شیشے کے نیچے اپنے پسندیدہ ادیبوں کے فوٹو رکھے ہوں۔

کھڑکیوں پر پردے شفق رنگ کے ہوں۔

پلنگ کا بچھونا :۔

گدے کے اوپر دری، اس پر نیلی سارٹن کی توشک اور توشک پر ریشمی کام کی چادر پائینتوں سارٹن کا لحاف۔ دورنگا بیچ میں شفق رنگ، حاشئے کی نیلے رنگ کی پٹی اور گوٹ بھی شفق رنگ کی اور استر نیلے رنگ کا۔ سرہانے دو تکیئے۔ تیتروں کے پروں کے۔ جن پہ دلآویز کڑھے ہوئے غلاف چڑھے ہوں۔ پائینتوں کبھی نیلا اور کبھی گلابی سلکن لباس شب خوابی تہہ کیا ہوا رکھا ہو۔ ایک تکیئے کا غلاف نیلے رنگ کا ہو گا۔ جس پر شفق رنگ پھول کڑھے ہوں گے، اور دوسرے تکیئے کا غلاف شفق رنگ کا ہو گا۔ اس پر نیلے پھول ہوں گے۔

دن کے وقت نیلی رنگی ہوئی ململ کا پلنگ پوش بستر پہ پڑا رہا کرے، اور پائینتوں خرگوش کی کھال کی سلب رکھی رہے۔

ٹاول ہینگر :۔

تولیہ اور سلکن یا اونی نائٹ گاؤن پڑے ہوں نیلے اور شفق رنگ و موسم کے لحاظ سے۔

شو ہینگر :۔

دو درجن جوتے دو قطاروں میں ٹنگے ہوں۔ شو شائن اور برش پالشنگ کلاتھ ساتھ رکھا ہو۔

وارڈروب کا سامان :۔

اس کے دروازوں میں اندر کی طرف دونوں جانب قدآدم شیشے لگے ہوں گے۔ اندر سے وارڈروب انچائی میں دو حصوں میں منقسم ہو، بیچ میں ایک پارٹیشن وال سے ہر ایک سوٹ اور شیروانی لٹکانے کے لئے قلابے لگے ہوں جن میں ہینگر لٹکائے جائیں گے اور نیچے سینے پرونے کا سامان رکھا ہو گا۔ اور ایک کیمرہ اور دوربین۔ دوسرے حصوں کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہو ایک اس دفعہ چوڑائی میں۔ بیچوں بیچ، اوپر کے حصے میں دو درجن قمیصیں رکھی جائیں گی اور نیچے کے حصے میں دراز کی طرح کی ایک چنیر لگی ہو گی، مگر اندر تختہ نہ ہو، بلکہ لکڑی کے چوبیں پتلے

پتلے رول سے ہوں، جن پر پتلونیں اور ٹائیاں لٹکائی جائیں گی۔ اور نیچے دو درجن رومال اور موزے بنیان اور انڈرویر اور تولیے رکھے ہوں گے۔

سنگار میز کا سامان :۔

چنبیلی کا تیل، کنگھے، برش، پاؤڈر، کریمیں، لوشنز وغیرہ وغیرہ اس کی دراز میں نیل کٹر اور ٹائلٹ کا مزید سامان رکھا ہو۔

لکھنے کی میز کا سامان :۔

جدید قسم کا قلم دان، پلاسٹک، پنچ مشین، پنز کوشن، پیپر ویٹس، کلپس، پیڈ اور اور لفافے، فٹ رول، پنسلیں، کلینڈر، ربڑ وغیرہ وغیرہ۔

میز پر لکھنے کی جگہ ایک گز شیشے کی مستطیل، اس کے نیچے اپنے ان دل پسند شعرا، افسانہ نگاروں اور نقادوں کی تصویریں رکھی ہوں :۔

غالب ٹیگور پریم چند اقبال فراق کرشن چندر

راجندر سنگھ بیدی سعادت حسن منٹو عصمت شاہد لطیف قرۃ العین حیدر

جوش مہندر ناتھ علی سردار جعفری کیفی اعظمی

میز پر دائیں ہاتھ کے کونے میں یہ رسالے پڑے ہوں :۔

اردو ماہنامہ ادب لطیف	انگریزی ماہنامہ	موڈرن ریویو
" " نگار	" "	فلم انڈیا
" " جاوید	" "	ساؤنڈ
" " ہمایوں	" "	فلم پکٹوریل
" " پریت لڑی	" "	ٹرنڈ
" " فسانہ	" "	لائف
" " نقوش	" "	فوٹو پلے

" دو ماہی شاہراہ " اسپیشل اسکوائر

" " سویرا " " کوریہ

(جب بھی نکلے) نیا ادب

میز کے سامنے والے بائیں ہاتھ کے کونے میں اپنے محبوبہ کا فوٹو۔

بک شلف کے اوپر کی فریم شدہ تصویریں :۔

گاندھی جی ، قائدِ اعظم ، پنڈت نہرو، سبھاش بابو، راجہ جی، وجے لکشمی پنڈت، سروجنی نائیڈو۔

ڈرائنگ روم :۔

سفید براق، دیواروں میں نیچے سے دو تہائی اونچائی پر ایک گز بھر کی ہلکے آسمانی رنگ کی پٹی پڑی ہوئی۔ اس ہلکے آسمانی رنگ کے پس منظر میں سبز بیلوں میں سفید پھول کھلے ہوئے، کمرے کے چاروں کونوں میں دیوار گیر اور ان میں آسمانی رنگ کے بلب لگے ہوئے، سامنے کی دیوار کی پوری لمبائی میں اور دائیں اور بائیں کی آدھی لمبائی میں شیشے کا ایک بڑا بک شلف جڑا ہو، دو خانوں والا۔ اس میں ایک اپٹوڈیٹ ادبی لائبریری سجائی جائے گی۔ جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کی مستند کتابوں پر مشتمل ہوگی۔ بک شلف کے اوپر بدھ کا اور گاندھی جی کا مجسمہ رکھا ہوا۔ ان کی پیشانیوں سے ارغوانی رنگ کی بجلی کا نور پھوٹ رہا ہو۔ اور ان سروں کے بیچ اسی رنگ کے ہالے ہوں اور ان دونوں کے بیچ میں تاج محل رکھا ہو اس میں سے دودھیا روشنی پھوٹ رہی ہو۔

فرش پر دری اور دری پر آسمانی رنگ کا قالین، کمرے میں دروازے کے سامنے آسمانی رنگ کے چمڑے کے کور کا صوفہ سیٹ پڑا ہو۔ دائیں اور بائیں دونوں طرف کی دیواروں کے ساتھ دیوان رکھے ہوئے، آسمانی کورز والے۔

بیچ میں ایک گول میز، شیشے کی سطح والی اور چھ کرسیاں، میز کے اوپر چھت سے لٹکتا ہوا ایک چاند تارا، بجلی کی روشنی کا آسمانی بلب، اور میز پر روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات۔

دو انگریزی روزانہ اخبار

ہفتہ وار (اردو) شاعر اور (انگریزی) بلٹز، مارچ، انڈیا اور السٹرٹیڈ ویکلی۔
کمرے کی دیواروں پر اس آسمانی رنگ کی پٹی کے نیچے چاروں طرف چغتائی آرٹ اور خوبصورت سین، سینری کی تصاویر نازک فریموں میں جڑی ہوئی۔
کمرے کے چاروں کونوں میں اونچے اونچے اسٹینڈز پر گلدان جن میں موسم کے پھول رکھے ہوں۔

ڈرائینگ روم :۔

سادہ فرش اور سادہ دیواریں
کمرے میں پارٹیشن کرٹن پڑا ہوا۔
پردے کے پیچھے سوٹ کیسز میں غیر موسمی کپڑے، ہولڈال، برساتی چھتری، گم بوٹس، چھڑی اور گھر کا تمام سامان قرینے سے رکھا ہوا اور دو بڑے جستی صندوق جن میں موسم سرما گزرنے پر اون اور روئی کے کپڑے اور دیگر اشیا محفوظ رکھی جائیں گی۔
ڈرائنگ روم میں پردے کے آگے ایک طرف دیوار کے ساتھ شیشے کی ایک الماری جس میں ظروف رکھے ہوئے ہوں۔ پلیٹیں، چمچے، کانٹے، ڈشیں، چائے کے سیٹ، گلاس وغیرہ وغیرہ۔
دوسری طرف ایک شیشے کی الماری میں سرکہ، اچار، مربے، چٹنیاں اور پھل وغیرہ رکھے ہوں۔
پردے کے آگے وسط میں ایک میز۔ اس پر ایک ریکارڈز کبرڈ اور ایک گراموفون، کبرڈ میں کلاسیکل اور فلمی دونوں طرح کے چیدہ چیدہ ریکارڈ رکھے ہوں گے۔
ڈرائنگ روم کے وسط میں ایک چوکور میز، کھانا کھانے کی اس پر ایک سفید براق میز پوش بیچ میں گلدان، سرخ پھولوں کا۔ اور گلاسوں میں سفید نیپکنز رکھے ہوئے اور نمک اور کالی مرچوں کی شیشیاں مسٹرڈ پوٹ۔

کمرے کی دیواروں پر فوٹوگرافی کے چند اچھوتے نمونے۔

باتھ روم:۔

پھول دار ٹائل، سفید دیواروں کی ایک تہائی اونچائی تک۔

وسط میں ایک دودھیا رنگ کا بلب لٹکتا ہوا۔

ٹب اور شاور لگا ہوا۔

ایک کونے میں دیوار کے ساتھ شیشے کی ایک مستطیل لگی ہوئی۔ اس پر ٹوتھ پیسٹ اور برش اور شیونگ کا اور نہانے کا تمام سامان رکھا ہوا۔ معہ کھلی کے ڈبے کے۔

شیشے کی مستطیل کے ساتھ دیوار میں آئینہ جڑا ہوا اور ایک طرف کھونٹیاں لگی ہوئی، کپڑے لٹکانے کے لئے۔

گھر کے سامان کی فہرست، قیمتوں کے ساتھ:۔

خواب گاہ:۔

دیواروں پر رنگ روغن ۲۰۰ روپے، فرشی دری ۴۰ روپے، قالین ۳۰۰ روپے، پلنگ ۱۰۰ روپے، مکمل بستر ۴۰۰ روپے، دو ڈریسنگ گاؤن ۵۰ روپے، خرگوش کی کھال کے چپل ۲۰ روپے، کتاب، پانی کا گلاس اور پھول رکھنے کی میز ۳۰ روپے، ریڈیو کی میز ۷۰ روپے ریڈیو ۵۰۰ روپے، وارڈروب ۶۰۰ روپے، شو ہینگر ۲۰ روپے، سنگار میز ۴۰۰ روپے، ٹاول ہینگر ۲۰ روپے، کیمرہ ۳۰۰ روپے، دوربین ۲۰۰ روپے، دو دو درجن سوٹ اور دوسرا لباس ۸۰۰۰ روپے، لکھنے کی میز معہ اسٹیشنری کے ۲۴۰ روپے، چھوٹا بک شلف ۷۵ روپے، دو الیکٹرک لیمپ معہ شیڈ کے ۱۰۰ روپے، تصویروں کے فریم ۵۰ روپے، میزان ۸۵۲۵ روپے۔

ڈرائنگ روم:۔

دیواروں پر رنگ روغن ۲۰۰ روپے، فرشی دری ۳۵ روپے، قالین ۳۱۵ روپے، چار دیوار گھڑی ۲۰۰ روپے، کتابیں ۵۰۰ روپے، بڑا بک شلف، شیشے کا کتابوں کے

لئے ۵۰۰ روپے، مرمر کا تاج محل، بدھ اور مہاتما گاندھی کے مجسمے ۵۰۰ روپے۔ دو دیوان ۶۰۰ روپے، صوفہ سٹ ۵۰۰ روپے، بیچ کی گول میز ۲۵۰ روپے، آٹھ کرسیاں ۲۵۰ روپے۔ چاند تارا ۱۵۰ روپے، تصویروں کے فریم ۵۰ روپے، چار بڑے گلدان معہ اسٹینڈ کے ۱۲۵ روپے میزان ۴۱۷۵ روپے۔

ڈائننگ روم :۔

میز اور کرسیاں ۱۵۰ روپے، شیشے کی الماریاں ۱۰۰۰ روپے، چینی کے ظروف اور کھانے کا دیگر سامان ۳۰۰ روپے، گراموفون معہ اس کی میز کے اور ریکارڈ معہ کبرڈ کے ۶۷۰ روپے، سٹور روم کا سامان ۵۰۰ روپے۔ میزان ۲۶۲۰ روپے۔

باتھ روم :۔

دیواروں کے ٹائل ۱۵۰ روپے، ٹب اور شاور ۳۰۰ روپے، واشنگ بیسن ۲۰۰ روپے، نہانے کا سامان ۳۰ روپے، میزان ۶۸۰ روپے

جملہ اخراجات :۔

خواب گاہ	۸۵۲۵	روپے
ڈرائنگ روم	۴۱۷۵	روپے
ڈائننگ روم	۲۶۲۰	روپے
باتھ روم	۶۸۰	روپے
میزان	۱۶,۰۰۰	روپے

روزانہ پروگرام :۔

صبح کاذب کے وقت اٹھنا، ضرورت سے فارغ ہو کر ہوا خوری کو چل دینا، سیر سے آکر جمناسٹک کرنا، زور کر چکنے کے بعد رات کے پانی میں بھیگے ہوئے چوبیس باداموں کے چھلکے اُتار کر انھیں مصری کے ساتھ رگڑ کر چاٹنا، پھر آرام کرسی پر لیٹ کر اخبار پڑھنا۔ آٹھ سے سوا آٹھ تک کی خبریں، ریڈیو پر سُننے کے بعد نہانے جانا۔ نہانے کے

بعد ناشتہ ہوگا۔

ناشتہ یہ ہوگا :۔

موسم گرما :۔ ایک پاؤ پیڑوں کی لسّی کا گلاس یا ایک پاؤ دہی کا اُدھ رڑ کا ، مٹھڑیوں کے ساتھ۔

موسم سرما :۔ آدھ سیر گرم گرم دودھ میں آدھی ٹکیہ مکھن ، اس کے ساتھ دو ٹوسٹ یا دو چھوٹے چھوٹے نمکین پراٹھے اور کوئی سبزی۔

نو بجے ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر چل دینا۔

ساڑھے نو بجے سے ایک بجے تک دفتر۔

ایک بجے دفتر سے گھر آکر کھانا کھانا۔

کھانا یہ ہوگا :۔

پہلے شوربہ ، پھر چاول ، دال اور کسی سبزی کے ساتھ۔ پھر روٹی ، گوشت (کبھی بھنا ہوا ، کبھی ٹوٹے مسالے ہیں کبھی لعاب پر اتر ہوا) کبھی قیمہ تو کبھی پسندے۔

کھانے کے ساتھ آدھ پاؤ دہی ، سلاد اور کچے شلجم یا چقندر بھی ہوں گے۔

آخر میں کچھ موسمی پھل بھی کھائے۔

اور چلتے چلتے کچھ مٹھائی چکھ لی۔

کھانے کے دوران میں سنگیت ضرور ہونا چاہیئے۔ ریڈیو پر ہو تو ٹھیک ، نہیں تو گراموفون ریکارڈ ہی سہی۔

کھانا کھا کے واپس دفتر۔

دو بجے سے ساڑھے چار بجے تک دفتر میں کام کرنا۔ دفتر سے سیدھے گھر پہنچنا۔

پانچ بجے ایک بڑا گلاس سنگترے یا موسمی کے رس کا پینا۔ وہ نہ ہو تو گنے کے رس کا گلاس ، نہیں تو ناریل کا پانی ہی سہی۔

اسے پی کر لکھنے پڑھنے بیٹھ جانا۔

ادھر دن ڈھلا اور سیر کرنے نکل گئے یا کسی سینما ہی میں جا بیٹھے۔
نو بجے رات کو گھر پہنچ گئے، ریڈیو پر خبریں سنیں، پھر کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ کھانا یہ ہو گا۔

پہلے شوربہ۔ پھر روٹی ایک سبزی کے ساتھ۔
اس کے بعد چاول، ایک شوربے دار سبزی اور دال کے ساتھ۔
رات کے کھانے میں گوشت نہیں ہو گا۔ اور دہی بھی نہیں، صرف سلاد ہو گا۔
اس کے بعد کچھ انگور اور انار اور چند دوسرے تازہ پھل۔
اور آخر میں ایک میٹھی ڈش۔
کھانا کھانے کے بعد ریڈیو بند کر دیا اور پڑھنے بیٹھ گئے۔
ادھر دس بجے کہ کتاب بند اور ریڈیو آن۔
ساڑھے دس بجے آدھ سیر گرم گرم میٹھا دودھ خوب سی ملائی کے ساتھ پیا اور بچھونے میں ریڈیو دھیما کر دیا۔ اور اس پر مدھم مدھم سروں میں موسیقی سنتے رہے، اور پھر سنتے ہی سنتے سو گئے۔ لیکن ریڈیو بند کر کے۔ نہیں تو آدھی رات کے وقت ماتا جی کو اٹھ کر بند کرنا ہو گا۔ اور پھر صبح وہ پھٹکاریں گی۔ لیکن ماتا جی وہاں کہاں ہوں گی۔ ورنہ ان کے پھٹکارنے میں بھی تو مزا آتا ہے۔

یہ تو ہوا روز کا پروگرام۔ اب رہا اتوار، اس کا پروگرام یہ ہو گا:۔
حسب عادت صبح سویرے اٹھے۔ سیر کو گئے۔ جمناسٹک کی۔ پھر بادام چاٹے۔ گھنٹہ بھر اخبار دیکھا۔

اور بجائے ناشتہ کرنے کے آدھ سیر دودھ میں دو کچے انڈے پھینٹ کے پی گئے اور پھر جو لکھنے بیٹھے ہیں تو ایک بجے تک لکھتے ہی رہے۔
لکھنے سے فارغ ہو کر نہائے، ریڈیو آن کر دیا اور سنگیت کی بوچھاڑ میں کھانا کھانے

بیٹھ گئے۔ اتوار کو کھانا خصوصی ہوگا یعنی :۔

دہی کی بریانی اور مُرغی کا سالن، یا مرغ پلاؤ اور قورمہ۔ (مُرغی کے بجائے کسی ہفتے تیتر، کسی ہفتے بٹیر اور کسی ہفتے کبوتر)

اور آخر میں زردہ، فیرنی کے ساتھ، جس پر پستے کی ہوائی پڑی ہوئی ہو یا پھر بڑی شبرال کے ساتھ۔

کھانا کھا کر سو رہے

دن ڈھلے ہفتے بھر کا کسل دور کر کے سو کے اُٹھے۔

بنے سنورے اور سیر گشت کو نکل کھڑے ہوئے۔

حسب معمول نو بجے گھر لوٹے۔ خبریں سنیں اور کچھ پڑھنے بیٹھ گئے۔

اتوار کی رات کو کھانا نہیں کھانا۔ اس طرح ہفتے میں ایک وقت کا فاقہ جسم میں فاسد مادے کو پیدا نہیں ہونے دیتا۔

لہٰذا ساڑھے دس بجے حسب معمول دودھ پیا اور بستر میں دبک گئے۔ اور ریڈیو سُنتے سُنتے گیارہ بجے سو گئے، تاکہ آنے والے ہفتے میں زندگی کی گہما گہمی کا پیر کی صبح تازہ دم، ہشاش بشاش اُٹھ کے خیر مقدم کریں۔

مرنے والے کا نام کیا تھا۔ یہ اس رات معلوم نہ کر سکا۔ دوسرے دن میں پھر اس کے کمرے میں گیا۔ ٹرنک کھولا۔ کچھ خط ملے جن پر اس کا نام اور ایڈریس درج تھا۔ مرنے والے کا نام ہربنس لال تھا۔ راولپنڈی میں پیدا ہوا۔ نوکری کی تلاش میں بمبئی آیا۔ بمبئی میں دس برس رہا۔ شادی نہیں کی تھی (شاید توفیق نہ ہوئی) عمر پینتیس برس!

میں یہ سب باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہ شخص عین جوانی میں مر گیا۔ یہ صرف ایک شخص کی موت کی داستان نہیں ہے اس موت میں میری موت بھی شامل ہے۔ ہزاروں کروڑوں انسانوں کی موت

شامل ہے۔ کیا کوئی ایسا نظام نہیں، جس میں ہر بنس لال کی خواب گاہ بن سکے۔ جہاں وہ اپنا پلنگ بڈروم کے لیے خرید سکے۔ سنگار میز، لکھنے کا سامان، ڈرائنگ روم، باتھ روم اور تمام چیزوں کو کھا پی سکے۔ جس کا ذکر اس Blue Print میں کیا گیا ہے۔

کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ آپ میرے خط کا جواب دیں گے؟

نوٹ :۔ اگر آپ اس کہانی کا نام Blue Print ہی رکھیں تو اچھی بات ہوگی۔

آپ کا خیر اندیش

رونق لال

قصبہ بوری ولی۔ کھولی نمبر ۱۲

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

علامہ اقبال

رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا

ساحر لدھیانوی

طنزیہ اور مزاحیہ افسانے

قومی درد

قومی درد، ایک ایسا درد ہے جو خاص طور سے ہندستان اور پاکستان میں ہر خاص و عام کو ہوتا ہے۔ چونکہ صدیوں سے یہ درد نسلاً بہ نسلاً چلا آرہا ہے اس لئے اگر اس درد کو اب سر درد کہا جائے تو بے جا بات نہ ہوگی۔

یوں سر دست سر درد کا علاج ہے مگر قومی درد کا ابھی تک کوئی علاج نہیں نکلا۔ مجھے تو قومی درد اور کینسر میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ یہ دونوں بیماریاں ابھی تک لاعلاج ہیں۔

اس درد کے تشخیص کرنے والے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ درد ہندو اور مسلمان کو زیادہ ہوتا ہے، کبھی کبھی سکھ کو بھی ہوتا ہے جب اس قسم کا درد سکھ کو ہوتا ہے تو حملے کی تیزی اور تندی کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا...... پرماتما کا شکر ہے کہ اس درد کا حملہ سکھ پر بار بار نہیں ہوتا۔ ورنہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا صفایا ہوجاتا۔ اور اس درد کا اس برّاعظم سے صفایا ہوجاتا۔

کافی تحقیق کے بعد اس مرض کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس درد کے موجد انگریز تھے مگر اس درد کے تحقیق کرنے والے کوئی آخری فیصلہ صادر نہیں کرسکے۔ فرنگیوں نے جہاں اس ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ وہاں اس درد کو بھی دونوں قوموں میں یکساں تقسیم کرکے چلے گئے تاکہ دونوں قومیں حشر تک آپس میں لڑتی رہیں۔ ایک دوسرے کو قتل کرتی رہیں

کو فیملی پلاننگ کے ماہرین کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے ۔ کہ اگر دونوں قوموں کی تعداد کو گھٹانا ہے تو اس درد کو قومی پیمانے پر بڑھانا چاہئے ۔ ریڈیو ۔ فلم اور اخباروں کا سہارا لے کر ایک وسیع پیمانے پر ایک عالم گیر تحریک چلائی جائے ۔ جس سے ان دونوں قوموں کے افراد میں کافی کمی ہو ہوسکتی ہے ۔

اعداد و شمار اور سائنسی نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر ہمارے لیڈر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ قومی درد پڑھے لکھوں کو زیادہ ہوتا ہے اور ان پڑھوں کو کم ـــــ دراصل اس درد کی ابتدا پڑھے لکھوں سے ہوتی ہے اور ان پڑھوں تک پہنچ کر انتہا کو پہنچ جاتی ہے ۔

اس درد کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ درد خاص کر اس کو ہوتا ہے جسے کبھی درد نہیں ہوتا ۔ یہ درد اکثر دور ۔ دور سے شروع ہوتا ہے ۔ اس درد کو آپ وبائی یا ہوائی بھی کہہ سکتے ہیں ۔ مثلاً اگر کوئی ہندو مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان میں مارا گیا ہو تو مرنے والے کا غم اس کے متعلقین کو نہیں ہوگا ۔ مگر جس مذہب سے مرنے والے کا تعلق ہوتا ہے وہ غم اور غصّے سے بیتاب ہو جاتے ہیں ۔ غم سے کم غصّے سے زیادہ ۔ مثال کے طور پر اس درد کا دورہ مدھیہ پردیش کے ہندوؤں پر ضرور ہوگا ۔ جبکہ بھی اگر کوئی مسلمان ہندوستان میں مارا جائے تو اس کے مرنے کا غم اس کے رشتہ داروں کو تو ہوگا مگر سب سے زیادہ غم مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو ہوگا ۔

یہ درد ایک فرد سے شروع ہو کے ۔ ایک طوفان بدتمیزی اختیار کر لیتا ہے ۔ آخر میں دونوں قومیں صف آرا ہو کے ۔ میدان میں نکل آتی ہیں ۔ اور ایک دوسرے کا خون بہا کے گھروں کو واپس لوٹ جاتی ہیں ۔ اس کے بعد اس درد کا تذکرہ روزانہ پرچوں ، ہفتہ وار روزنامہ اخباروں اور رسالوں میں خوب زور و شور سے کیا جاتا ہے ۔ بڑی بڑی سُرخیوں میں اس جنوں کو بے نقاب کیا جاتا ہے ۔ بڑے شاندار اور جاندار جلوس نکالے جاتے ہیں ۔ انہی جلوسوں میں ظالمانہ اور جاہلانہ تقریریں کی جاتی ہیں ۔ یہ تقریریں جاہلانہ زیادہ ہوتی ہیں ظالمانہ کم ۔ پھر حکومت کمیشن بٹھاتی

ہے ۔ جج فیصلہ کرتے ہیں کہ کس قوم کی زیادتی تھی ۔ پھر اس امر پر غور کیا جاتا ہے ۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے کلچر کا تحفظ کیا جائے ۔ ہندو اپنے کلچر کے تحفظ کے لئے شور وغل مچاتے ہیں اور مسلمان اپنی بقا کے لئے خون کے آنسو بہاتے ہیں ۔

دونوں قومیں اپنے اپنے کلچر کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں حالانکہ ان دونوں کا کلچر Agriculture سے زیادہ اہم نہیں ہے ۔

اس درد کو نیست و نابود کرنے کے کئی طریقے سوچے گئے ۔ اور آزمائے بھی گئے ۔ کچھ عرصے کے بعد پتہ چلا کہ سوچنے اور آزمانے والے تو نیست و نابود ہو گئے ۔ مگر اس درد میں کمی نہ ہوئی ۔ کبھی کبھی یوں بھی سوچا گیا کہ بڑے بڑے پلیٹ فارموں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکٹھا کیا جائے ، بلکہ اکٹھا کیا گیا ۔ اور دونوں سے کہا گیا کہ گلے لگ جاؤ ۔ بھائیو ۔ مگر گلے ملنے کی بجائے دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے گریبان تک پہنچ گئے ۔ یعنی درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ درد پیٹ میں نہیں ہوتا ۔ یہ درد پہلے دماغ سے شروع ہوتا ہے ۔ وہاں سے اس کا زہر سارے جسم میں سرایت کرتا ہے ۔ آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ ہو جاتی ہیں ۔ مُنہ سے کف نکلنے لگتی ہے جسم پر ایک تشنج سا طاری ہو جاتا ہے اور آدمی چھرا یا پستول یا لاٹھی لے کر باہر کی طرف لپکتا ہے ۔ اس وقت اس کی حالت پاگلوں کی طرح ہو جاتی ہے ۔ اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا ۔ اس درد کو کم کرنے کے لئے دوسروں کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیتا ہے ۔ پھر ہر ہر مہادیو یا اللہ اکبر کا نعرہ لگا کے ناچنے لگتا ہے ۔ بس اسی طرح باقی لوگ بھی اس درد میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ درد صرف مردوں کو ہوتا ہے ۔ عورتوں کو تو ہوتا ہی نہیں ۔

کئی بار اس قسم کے بیماروں کو قتل کے بعد اس بات کا پتہ چلا کہ مرنے والا اس کا ہم مذہب تھا ۔ غصے سے پھر کر وہ پھر کئی ایک کو مارتا ہی رہتا ہے ۔ اور جب کوئی

انسان اسے نہیں ملتا۔ تو دیواروں سے ٹکریں مار کر خود مر جاتا ہے۔ اس قسم کے مریضوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اگر اس قسم کے مریضوں کی تعداد بڑھ جائے تو شاید اس مرض کا علاج نکل جائے۔ دراصل اس مرض کے تحقیق کرنے والوں کو اس قسم کے مریضوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ شاید انہی مریضوں سے کوئی اکسیر نکل آئے۔ کیوں کہ جن مریضوں میں احساس گناہ ہوتا ہے انہی کے خون سے کوئی کیمیائی مرکب تیار کیا جاسکتا ہے جو آگے جاکر اس درد کی دوا بن جائے۔

اکثر ہندوؤں سے کہا جاتا ہے کہ اس دردِ مسلسل کو کم کرو تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ مشورہ مسلمانوں کو دو ران سے کہو کہ وہ اس سر درد کو کم کریں۔ اگر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ اس درد سے بچنے کی کوئی راہ نکالیں تو وہ کہتے ہیں کہ اس کا آغاز تو ہندو کرتے ہیں۔ دراصل دونوں قومیں اتنی معقول اور ساتھ ہی نامعقول ہیں کہ کوئی بھی اس درد کو کم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

یہ درد اکثر اکثریتی کمیونٹی کو اس لیئے ہوتا ہے کہ اس کی تعداد اقلیتی کمیونٹی سے زیادہ ہے۔ اور اقلیتی کمیونٹی کو اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی تعداد اکثریتی کمیونٹی سے کم ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے خائف نظر آتی ہیں۔ یوں تو مفکروں نے کہا ہے کہ جس قوم کو قومی درد نہیں ہوتا وہ قوم کبھی ترقی کے زینے پر نہیں چڑھ سکتی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس قوم کو یہ درد ہوتا ہے۔ وہ قوم بڑی بے درد ہوتی ہے۔

مرحوم یاد

جب کبھی مرحوم یاد چکوی کی یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ نقادوں اور قارئین کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ انھوں نے مرحوم یاد کی ذات کے متعلق کئی مضامین لکھے اور ملک کے ادبی رسالوں میں چھپوائے۔ اِدھر ایک دو سال میں ان کی ذات گرامی کے بارے میں دو کتابیں مارکیٹ میں آچکی ہیں اور یونیورسٹی کے کئی طلبا ران کی ذات کے متعلق تحقیق بھی کر رہے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ انہی طلبا کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی مل جائے۔ مگر ان کی شاعری کے بارے میں ابھی تک ایک مضمون بھی نہیں چھپا۔ معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مرحوم یاد چکوی اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ غزل ان کی اوڑھنا بچھونا تھی۔ مگر مرحوم یاد کے کردار کی صفات کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اب مرحوم کی شاعرانہ عظمت سے ہر شخص منکر ہوگیا ہے۔

دراصل اس پہلو پر کافی ریسرچ ہو رہی ہے کہ کیا مرحوم یاد واقعی ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے بیشمار شاگرد تھے۔ جو ہندوستان کے ہر شہر میں ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد بزمِ یاد کی تیاریوں میں ہمیشہ مصروف رہے۔ لیکن مرحوم یاد کی بدقسمتی ملاحظہ فرمایئے کہ مرحوم جب تک زندہ رہے ایک بزم بھی نہ بن سکی۔ صرف تیاریاں ہی تیاریاں ہوتی رہیں۔ جشن کے اعلان ہوتے رہے لیکن ان کے اعزاز میں ایک جشن بھی منعقد نہ ہوا۔ مرحوم یاد شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح فرماتے تھے، مگر اصلاح کا

معاوضہ نہ لیتے۔ مرحوم نے اپنے فن کی بالکل پرواہ نہ کی۔ بلکہ ساری عُمر شاگردوں کے فن کو ہی اُبھارتے رہے۔ شاگردوں کو اپنے اُستاد سے اتنا پیار تھا کہ انھوں نے کئی بار مرحوم کی غزلوں کو اپنے نام سے چھپوالیا۔ مرحوم کے نزدیکی رشتے داروں اور دوستوں نے اس بدعت کی طرف اشارہ بھی کیا۔ سُنتے ہی مرحوم یادؔ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ دراصل وہ جذباتیت کے علمبردار تھے۔ انھیں ہر بات پر رونا آتا۔ بے چارے آنسو بہا کے چُپ ہو جاتے۔ انھوں نے کبھی کسی شاگرد کے خلاف کوئی ایکشن نہ لیا۔ ان کی ذہانت اور ذکاوت کے چرچے ہر جگہ ہوتے رہتے۔ زبان و بیان پر انھیں بڑا عبور تھا۔ خوب صُورت لفظوں کا انتخاب، تشبیہوں کا ذخیرہ، زور بیان، بے پناہ روانی، پُرشکوہ لفظوں کا استعمال۔ نادر تشبیہوں کی آمد۔ اور نہ جانے کتنی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک تھے کہ ان کے آگے انیسؔ اور دبیرؔ پانی بھرتے نظر آتے۔ ان کی ساری عُمر یہی کوشش رہی کہ کسی طرح ان کا دیوان چھپ جائے۔ مرحوم یادؔ کا جنازہ بھی اُٹھ گیا۔ لیکن ان کا دیوان نہ چھپ سکا۔ ایک تحقیقی مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ مرحوم یادؔ کا جنازہ بڑی شان وشوکت سے نکلا۔ شہر کی بیشتر آبادی ان کے جنازے میں شامل تھی۔ جب دیوان چھپوانے کے لئے روپیوں کی اپیل کی گئی تو کسی شہری نے ایک روپیہ بھی نہ دیا۔

مرحوم یادؔ کی شخصیت کے بارے میں ریسرچ ہوئی اور جتنے تحقیقی مضامین رسالوں میں چھپے وہ سب میری نظر سے گزرے میں انھیں بڑے شوق اور غور سے پڑھتا رہا۔ ان کے بارے میں پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ مرحوم یاد کو اُردو ہندی اور انگریزی پر پورا عبور تھا۔ اگر وہ چاہتے تو ہندی اور انگریزی زبان میں بھی اپنے ادبی جوہر کو نمایاں کر سکتے تھے۔ مگر انھیں اردو سے بے پناہ محبت تھی۔ پیدائش سے لے کر موت تک اسی زبان میں گفتگو کرتے رہے، اور اسی زبان میں غزلیں کہیں۔ مختلف مضامین پڑھ کر مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ مرحوم یادؔ بڑے پُرخلوص دیانت دار، شریف، خدا پرست، وطن پرست، دوسروں کی حاجت پورا کرنے والے خود نہ

کھاکر دوسروں کو کھلانے والے، دوست نواز، غریب نواز، ادیب نواز، قربانی اور سچائی کے پیکر، ہندو مسلم ایکتا کے حامی، بردبار، مہربان اور مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے۔ شروع میں دوستوں اور مداحوں نے اس صفت کی بہت مدح سرائی کی۔ بعد میں یہی دوست ان کے دشمن بن گئے۔ اور ان کی قوتِ برداشت کو بزدلی سمجھنے لگے۔ لیکن اس مردِ مجاہد نے اپنی روش نہ بدلی۔

یوں دیکھنے میں بڑے خوش وضع اور خوش قطع تھے۔ لانبا قد، گوری رنگت، چہرے کے خطوط بڑے دلکش اور جاذب نظر تھے آنکھیں بڑی بڑی، فراخ پیشانی لانبے لانبے بال، جو اکثر کندھوں تک آجاتے۔ خوش شکل ہونے کے باوجود بھی انھوں نے صرف ایک شادی کی۔ اگر وہ چاہتے تو بڑی آسانی سے چار شادیاں کر سکتے تھے۔ آخری عمر تک ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا۔ اپنی بیوی کے سوا سب کو ماں بہن سمجھتے تھے۔

شادی کے بعد چار چاندسی لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جب لڑکیاں جوان ہوئیں تو ان کی بیوی چلّانے لگی کہ اب اپنی جوان لڑکیوں کی شادی کرو۔ گھر میں اُلّو بولتے تھے۔ روپے پیسے کی اس قدر کمی تھی کہ بڑی مشکل سے دو وقت کا کھانا نصیب ہوتا۔ بیٹیاں دولہا کا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں۔ جب انھیں اس بات کا مکمل یقین ہوگیا کہ ان کے والدین ان کے لیے دولھا نہ لاسکیں گے تو چاروں لڑکیوں نے خود اپنے لیے شوہر تلاش کر لیے۔ اور یکے بعد دیگرے مختلف لڑکوں کے ساتھ بھاگ گئیں۔ اور اپنا اپنا گھر بسا لیا۔ مرحوم یادؔ اپنی بیٹیوں کے اس ترقی پسندانہ اقدام پر بہت خوش ہوئے اور اس خوشی میں کئی دن گھر سے باہر نہ نکلے ــــ اس ہولناک واقعہ کے بعد ایک قریبی رشتہ دار نے بتایا کہ مرحوم یادؔ کافی دنوں تک روتے رہے اور ہنستے بھی رہے۔ جہاں تک رونے کا تعلق ہے اس کے بارے میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں۔ ہاں ہنستے کیوں تھے اس کے بارے میں ہمارے نقاد یا ذہین طلبا رتحقیق کیوں نہیں کرتے۔؟

ان کے کردار کے بارے میں بڑے ہی دلچسپ قصے مشہور ہیں۔ مثلاً مانگنے سے وہ اس قدر گھبراتے تھے کہ ہات پھیلاتے ہوئے ان کے ماتھے پر پسینہ آجاتا، زبان گنگ ہو جاتی۔ گلا خشک ہونے لگتا۔ اور آخر میں جس شخص سے مانگنے جاتے اسے کچھ دے کر ہی آتے۔ کافی تحقیق کے بعد پتہ چلا ہے کہ آخری عمر میں ان کی بیوی نے ان سے طلاق لے لی اور ان کے نزدیکی دوست سے شادی کرلی۔ مرحوم یاد کو اپنی بیوی پر غصہ نہ آیا بلکہ محلے میں انھوں نے پیڑے بانٹے، یہ سوچ کر کہ آخری عمر میں ان کی بیوی کو دو وقت کا کھانا تو نصیب ہوا۔ اس واقعے کے بعد گلی محلے والوں نے ان سے بول چال بند کردی۔ بھلا جو شخص مرد ہو کر اپنی مردانگی کا اظہار نہ کرے اس سے دعا سلام رکھنے سے کیا فائدہ ایسے انسان کو سنگسار کرنا چاہئے۔ شہر کے باشندوں نے باقاعدہ ایک پلان بنایا کہ ایسے انسان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے مگر عین وقت پر فلو کی ایسی وبا پھیلی کہ شکار کرنے والے خود ہی اس وبا کا شکار ہو گئے۔

یوں مرحوم یاد نے بڑی لمبی عمر پائی۔ چوراسی سال کی عمر تک جیئے۔ آج سے بیس برس پہلے کہا جاتا تھا کہ زیادہ کھاؤ گے تو لمبی عمر پاؤ گے۔ مگر آج کل ڈاکٹر اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ کم کھاؤ گے تو لمبی عمر پاؤ گے۔ مرحوم یاد کو اول تو کھانا ملتا ہی نہ تھا۔ اگر مل جاتا تو وہ اگلے دن کے لئے ضرور بچا کر رکھتے۔ آخری عمر تو فاقوں کی نذر ہوگئی۔ لیکن جناب! فاقہ کرتے ہوئے انھوں نے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے کسی سے کچھ نہ مانگا۔ اپنی اَنا کے بل بوتے پر جیئے۔ بھوک سے آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ گال پچک گئے تھے مگر آفریں اس شخص پر کہ اس مرد مجاہد نے اپنے کردار کو ایسا سنبھالا کہ سچائی، خودداری، خلوص، پیار، بردباری پر آنچ نہ آنے دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فاقوں سے روحانی طاقت بڑھتی ہے۔ قوتِ برداشت اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے دیش کے سیاسی لیڈر اکثر مرن برت رکھتے ہیں۔ تاکہ لمبی عمر پائیں اور جنتا کی حالت بگاڑ کر پدم شری کا خطاب حاصل کریں۔

مرحوم یادؔ شہرت کے دلدادہ نہ تھے۔ کوئی ان کی تعریف کرتا تو فوراً اسے جھڑک دیتے۔ مگر دوسروں کی تعریف کرتے ہوئے کبھی نہ تھکتے۔ معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ حکومتِ ہندان کے بے داغ کردار سے اتنی متاثر اور مرعوب ہوئی ہے کہ وہ جلدی ایک تحقیقی کمیشن بٹھانے والی ہے۔ جس میں مرحوم یادؔ کی اچھائیوں کے بارے میں ثبوت طلب کرے گی اور اس بات کی تہہ تک پہنچے گی کہ کیا مرحوم یادؔ واقعی پُرخلوص اور دیانت دار آدمی تھے۔ کیا ان میں اتنی قوت برداشت تھی کہ وہ کئی دن تک بغیر کھانا کھائے کام کر سکتے تھے؟ کیا مرحوم خوددار تھے کیا انھوں نے کسی سے قرض لیا یا نہیں؟ کیا انھوں نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے یا نہیں؟ کیا مرحوم یادؔ واقعی وطن پرست تھے یا وطن فروش یا محض غزل فروش؟ کیا مرحوم واقعی ہندو مُسلم ایکتا کے حامی تھے۔ کیا مرحوم کا دیوان چھپا یا نہیں۔ کیا مرحوم اتنے بڑے شاعر تھے کہ ان کا دیوان چھاپا جائے۔ کیا مرحوم یادؔ جدیدیت کے حامی تھے یا ترقی پسند تحریک کے۔ کیا مرحوم یادؔ کی غزلیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ کیا مرحوم یادؔ کی اچھائیوں اور خوبیوں کو اپنا کر ہماری قوم ترقی کر سکتی ہے۔ اگر واقعی مرحوم یادؔ اتنی اچھائیوں اور خوبیوں کے مالک تھے تو انھیں قومی ہیرو کیوں نہ تسلیم کیا جائے۔ لوگوں کو زندگی میں شہرت ملتی ہے۔ مرحوم یادؔ کو مرنے کے بعد کیوں نہ شہرت ملے۔ اگر مرحوم واقعی اتنی خوبیوں کے مالک تھے تو بھارتی عوام کو ان کے نقشِ قدم پہ چلنا چاہیئے اور مرحوم کی اچھائیوں کو ہر طرح سے اجاگر کرنا چاہیئے۔ مثلاً پریس میں ان کے کردار کے بارے میں مضامین چھاپے جائیں۔ شہروں میں بڑے بڑے سائن بورڈ لگوائے جائیں۔ ان کے اوصافِ حمیدہ کے بارے میں ریڈیو، ٹیلی ویژن پر باقاعدہ پراپیگنڈہ کیا جائے۔ اسکولوں، کالجوں میں ان کے کردار کے بارے میں لیکچر رکھوائے جائیں تاکہ آنے والی نسلیں ان کی اچھائیوں اور خوبیوں سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔ اگر ہو سکے تو کسی فلم پرڈیوسر کو اس بات پر راضی کیا جائے کہ وہ ان کی زندگی کے متعلق ایک بامقصد فلم بنائے اور ہماری حکومت اس پرڈیوسر کو قرضہ دے تاکہ ساری قوم اس خلوص، پیار، ایثار، خودداری، قربانی کی اسپرٹ

قوتِ برداشت اور دیگر اوصافِ حمیدہ کی گرویدہ ہو جائے اور کشمیر سے لے کر راس کماری تک ایک نئے جیون کا آغاز ہو۔

دراصل مجھے ذاتی طور پر بہت بڑا اعتراض ہے اس کمیشن کے تعینات کئے جانے پر اگر میں سچ بات کہہ دوں تو قارئین کو میرے مشورے کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

میری نظر میں مرحوم یاد بہت ہی بڑے بے وقوف قسم کے آدمی تھے جن خوبیوں کو ہم آج تک سراہتے رہے دراصل وہ میری نظر میں برائیاں ہیں۔ مثلاً اپنا کام نہ کرنا اور دوسرے کے کام کرتے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے، خود نہ کھانا اور دوسروں کو کھلاتے رہنا بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ خود ننگے رہنا اور دوسروں کو کپڑے پہنانا کہاں کی شرافت ہے۔ اپنے گھر کو اُجاڑ کر دوسرے کے گھر کو آباد کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

جیسا کہ ان کے ہر ناقد نے ان کے لانبے قد گوری رنگت اور خوبصورت خدوخال کی تعریف کی ہے تو یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ انھوں نے صرف ایک شادی کیوں کی؟ وہ بڑی آسانی سے تین چار شادیاں کر سکتے تھے۔ اگر وہ اپنی ذہانت سے مستفید نہیں ہوئے تو کم سے اپنی جسمانی خوبصورتی سے تو فائدہ اُٹھاتے اور کسی ایسی عورت سے شادی کرتے جو کمانے کے قابل ہوتی تاکہ ان کا بُڑھاپا تو تمیز سے گزرتا اور مرحوم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ مرتے۔

جہاں تک ان کی اس صفت کو سراہا جاتا ہے کہ انھوں نے مرتے دم تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے اور وہ کسی کے قرضدار نہ تھے۔ تو اس سلسلے میں یہی عرض کروں گا اگر ہماری سرکار اس خوبی کو اچھا جان کر عمل نہ کرتی تو ساری قوم بھوکی مرجاتی۔ بھارت سرکار کی اس سلسلے میں جتنی تعریف کی جائے کم ہے کہ انھوں نے قرض مانگنے کی مہم میں کسی دیش کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ ہر دیش کے سامنے اپنی جھولی پھیلائی۔ اور اپنے عوام کو مالا مال کیا۔ اس طرح اگر مرحوم یاد اپنے پرستاروں، اپنے دوستوں اپنے شاگردوں اور اپنے رشتے داروں سے قرض مانگتے تو یقیناً ان کے پاس ایک کار ایک بنگلہ اور اچھا خاصا بینک بیلنس ہوتا۔ اور وہ

ایک بھکاری کی طرح نہ مرتے ۔ جہاں تک ان کی خودداری کا نتیجہ ایثار اور جذبۂ قربانی کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن میں کامن سینس کی کمی تھی ۔ جن لوگوں نے ان نام نہاد خوبیوں کو اپنا یا وہ قلاش ہو کے مرے ۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ حکومتِ ہند اس قسم کے کمیشن کو نہ بٹھائے بلکہ اس قسم کی فرسودہ قدروں اور کھوکھلے اصولوں کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلائے تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں مرحوم یاؔد سے عبرت حاصل کریں اور وہ ایک باوقار اور باسلیقہ زندگی گزار سکیں ۔

شرافت

دراصل شرافت اور خباثت میں زیادہ فرق نہیں ہے جس طرح خبیث آدمی اپنی خباثت کا ڈھنڈورا پیٹنے سے باز نہیں آتا بالکل اسی طرح شریف آدمی اپنی شرافت کا مظاہرہ کرنے سے کبھی نہیں شرماتا۔

تقریباً ہر مذہب کی مقدس اور الہامی کتابوں میں شریفوں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا اور خبیثوں کو گالیوں سے نوازا جاتا ہے۔ شریفوں اور خبیثوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ شریفوں کو مرنے کے بعد جنت ملتی ہے اور خبیثوں کو زندگی میں۔ اس فانی دُنیا میں شریفوں نے ہمیشہ مار کھائی ہے اور خبیثوں نے ہمیشہ مارا ہے۔ شریفوں کو ان کی ازلی شرافت کے لیے سنگسار کیا گیا۔ خبیث سیدھا بار میں گیا۔ اور یار دوستوں کے ساتھ، جام پہ جام چڑھاتا ہوا، زندگی کی لطافتوں اور رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا دوزخ میں وارد ہوا۔

شرفا رشرافت کے پردے میں، ایک مقدس اور پرہیزگار زندگی بسر کرنے کے لئے جتنے ظلم اپنے اُوپر کرتے ہیں۔ ان کو گنوانا ضروری نہیں۔ یہ لوگ کن کن چیزوں سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں۔ اگر ان کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کی جائے اور شرفا راس فہرست کو پڑھ لیں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فہرست پڑھتے ہی وہ فوراً خبیث بننے پہ آمادہ ہو جائیں گے۔

میں نے ڈاکٹروں اور حکیموں کی طرح، بڑی پابندی سے شرافت کی چالیس سال تک پریکٹس کی ہے۔

ڈاکٹروں اور حکیموں نے ضرور اپنے لیے بنگلے اور کوٹھیاں بنوالی ہوں گی مگر میں ایک کھولی کا باقاعدگی کے ساتھ کرایہ ادا کرنے کے قابل بھی نہ ہوا۔

جس طرح سے خبیثوں کی طرح طرح کی قسمیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح شریف بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ چند ازلی شریف ہوتے ہیں۔ کچھ پیدائشی۔ پھر خاندانی شریف بھی ہوتے ہیں۔ جو شرافت کو بطور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ چند وقتی طور پر شرافت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ انھیں شریف بدمعاش کے لقب سے پکارا جائے تو بے جا بات نہ ہوگی۔

ازلی شریف بڑا ہی ناکارہ قسم کا انسان ہوتا ہے۔ اسے سدھارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کا بیکار وقت ضائع ہوگا۔ جہاں تک خاندانی شریفوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ خاندانی شریف صرف اپنا ہی بیڑا غرق نہیں کرتے بلکہ پورے خاندان کا بیڑا غرق کرتے ہیں۔

پیدائشی شریف اگر شادی نہ کرے تو صرف اپنی ذات کو نقصان پہنچائے گا ورنہ اس شریف انسان کے جو اولاد پیدا ہوگی۔ وہ گلیوں میں خاک چھانتی پھرے گی۔

وہ لوگ جو شرافت کو بطور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں شاید چند بہاریں آجائیں۔ ورنہ شرافت ہمیشہ ان کو ذلیل و خوار کرتی ہے۔ شرافت ایسا لفظ ہے، جو ایک بار کسی انسان کے ساتھ چپک گیا تو ساری عمر کا ساتھی بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اسے یاد کرتے ہیں ــــــ "بچارا بڑا ہی شریف انسان تھا"

یوں تو لفظ شرافت کو بڑی سنجیدگی اور احترام سے برتا جاتا ہے اور شریفوں کا از راہِ شرافت کافی احترام کیا جاتا ہے ذرا شریفوں کے چہرے ملاحظہ فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ چہروں پر کتنی نحوست برستی ہے۔ شامتِ اعمال سے اگر آپ نے کسی شریف آدمی کو اپنے یہاں مہمان ٹھہرا لیا تو چند ہی دنوں میں آپ کا جینا جاگتا گھر ویرانے کی صورت اختیار کر لے گا۔ بس بھول کر ایسی غلطی نہ کیجیے گا ــ!

شریفوں کے یہاں اکثر اولاد ہوتی ہی نہیں۔ اگر ہوتی ہے تو بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بہرحال ہر حالت میں شریف آدمی کا انجام بڑا حسرت ناک اور المناک ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد گھر سے کفن کے لئے ایک کوڑی بھی نہ ملے گی۔ اکثر شریفوں کے جنازوں کے ساتھ اپنوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔

کسی شریف آدمی سے روپے مانگئے۔ اوّل تو روپے اس کے پاس ہوتے نہیں۔ بالفرض روپے اس کے پاس ہوئے تو وہ بے چارہ اپنی شرافت سے مجبور ہو کر فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے گا۔ اگر اپنی جیب خالی نکلی تو بیوی کی جیب صاف کرے گا۔ اگر وہاں بھی کچھ نہ ملا تو پڑوسی کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھائے گا۔ بدقسمتی سے اگر پڑوسی نے بھی انکار کر دیا تو اپنی بیوی کی پوٹلی گروی رکھ کر اپنی شرافت کو برقرار رکھے گا۔

دراصل شرافت کسی خطرناک بیماری سے کم نہیں۔ آج کل ہر بیماری کا علاج ہے، سوائے کینسر کے۔ یوں تو ڈاکٹروں نے کینسر کی روک تھام کا طریقہ نکالا ہے۔ مگر شرافت ایسا روگ ہے جو ایک بار لگ گیا تو عمر بھر کا سوگ بن کر رہ جاتا ہے۔

بدقسمتی سے میرا شمار بھی شریفوں میں ہوتا ہے۔ شروع میں جب یار دوستوں نے میری شرافت کی تعریف کی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ "اجی صاحب کیا شریفانہ اور قلندرانہ طبیعت پائی ہے۔ اپنے کام پر لات مار کر دوسروں کا کام کرتے ہیں۔ اپنے سود و زیاں کی کوئی فکر نہیں۔ کوئی مہمان آجائے تو بس آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں رکھتے۔ انکساری، خلوص، دیا اور دھرم تو مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

دراصل نہ مجھے دھرم پر وشواس ہے نہ دیا پر — جہاں تک انکساری اور خلوص کا تعلق ہے وہ میرے مزاج کا ایک حصّہ ہے جس طرح سے میں لوگوں سے سلوک کرتا ہوں۔ اس کا انسانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ بس یوں سوچئے کہ اس قسم کی حرکتیں کر بیٹھتا ہوں۔ اسی لئے اب شرافت سے اس قدر نالاں ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ آج کل کیا عرض کروں جس تیزی اور

تندہی سے اس شرافت کو مٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کمبخت اسی برق رفتاری سے یہ بیماری اور ابھرتی ہے۔

اگر شرافت اور عشق پر ذرا تحقیقی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں زیادہ بُعد نہیں۔ دونوں بیماریاں ایسی ہیں جن کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں۔

جیسے چند لوگ عاشقانہ مزاج لے کر پیدا ہوتے ہیں اسی طرح شریف لوگ شریفانہ مزاج لے کر اس دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔

جیسے عاشقوں کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں ہوتی اور جذبۂ عشق میں سرشار اور غرقاب رہتے ہیں۔ بجنسہٖ شریف آدمی شرافت کو برتنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ اگر عاشق اپنا گریبان چاک کرتا ہے تو شریف آدمی بے حد کم ٹاک کرتا ہے۔ اگر عاشق، معشوقہ کے نہ ملنے پر دن رات خون کے آنسو بہاتا ہے تو شریف آدمی اگر اپنی شرافت کا اظہار نہ کرنے پائے تو خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رُلاتا ہے۔ اگر عاشق اپنا گھر برباد کرکے محبوبہ کا گھر آباد کرتا ہے تو شریف آدمی اپنا گھر برباد کرکے دوسروں کا گھر آباد کرتا ہے۔

میں نے بڑے بڑے عاشقوں کے بڑے ہی حسرت ناک انجام دیکھے ہیں۔ پھر بھی چند گنے چُنے ایسے عاشق ضرور ملیں گے جنھوں نے اپنی اپنی محبوباؤں کو پاکر اپنی زندگیاں بنالی ہوں۔ مگر خدا کے فضل سے میں نے کسی شریف آدمی کو شرافت سے زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کا انجام اتنا حسرت ناک اور المناک ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ چاک چاک ہوتا ہے۔

شریفوں کو اپنی شرافت کی سزا اسی دُنیا میں مل جاتی ہے۔ خبیثوں کو مرنے کے بعد۔ شریف آدمی اس دنیا میں بھوکے مرتے ہیں۔ اور خبیث مزے سے عیش کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہ نعرہ بلند کیا جاتا تھا۔ کہ "دُنیا کے مزدورو! متحد ہوجاؤ!! تمھاری صرف زنجیریں ٹوٹیں گی اور کچھ نہیں۔" میں سمجھتا ہوں اب وقت آگیا ہے کہ میں دُنیا کے شریفوں سے

بہ بانگِ دُہل کہوں کہ اے دُنیا کے شریفو! شرافت کی زنجیریں توڑ دو!! تم سب کی زندگیاں سدھر جائیں گی۔"

بڑے بڑے عقل مندوں کا مقولہ ہے کہ اگر اس دُنیا میں خبیث آدمیوں کی کمی ہو جائے تو یہ دُنیا رشکِ جنّت بن جائے۔ مگر میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس دُنیا میں اگر شریفوں کی تعداد صفر کے برابر ہو جائے تو یقیناً انسانی زندگی بہتر ہو جائے گی۔ اس لئے دُنیا کے تمام انسانوں کی بہتری اور بقا کے لئے یہ نعرہ بلند کرتا ہوتا ہوں۔

"شرافت مُردہ باد! خباثت زندہ باد!!"

لیجئے ہم نے پھر عشق کیا

عشق جیسی لطیف شے، جس پر ہمارے مشہور و معروف شاعروں اور افسانہ نگاروں نے افسانے لکھ کر غیر فانی شہرت حاصل کی ہے اور بہت سے عاشقوں اور معشوقاؤں نے اپنی زندگی کی بازی لگا کر ادبی داستانوں میں جگہ بنائی ہے۔ اسے مزاحیہ انداز میں پیش کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ لیکن بندہ نواز، میں بے بس لاچار اور مجبور ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، رومیو جولیٹ کے عشقیہ داستانوں نے نوجوانوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

اور وہ عشق کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ حال ہی میں مرحوم جان کینیڈی کی بیوہ نے ایک ستر سالہ بڈھے سے عشق فرما کر اور اس کے بعد ازدواجی بندھن میں بندھ کر مردوں کی بڑی ہمت افزائی کی ہے۔ اس سے عشق کی راہیں استوار اور ہموار ہوئی ہیں۔ اور عشقیہ ماحول کافی خوشگوار ہوا ہے۔

حضورِ انور! میری عُمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ میں خضاب لگا کر عالمِ شباب کے مزے لینا چاہتا ہوں۔ اسے میری خوش قسمتی سمجھئے یا بد قسمتی۔ کیوں کہ ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ عشق کرنے والوں کو خوش قسمت سمجھنا چاہئے یا بد قسمت۔ اس کا فیصلہ آپ ہی کیجئے۔ یوں اس سے پہلے میں کئی عشق کر چکا ہوں۔ گو زندگی میں

ایک ہی عشق کافی ہوتا ہے۔ مگر میں تو اس صف میں کھڑا ہوں جہاں عشق ایک مسلسل بیماری کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یعنی جونہی ایک عشق ختم ہوا دوسرا چالو۔۔۔

سچ پوچھئے تو میں کہوں گا کہ اس عشق سے پہلے جو میں نے محبت کی تھی وہ بڑی جان لیوا تھی یعنی میں مرتے مرتے بچا۔ اگر آپ نے دُنیا کی مشہور عشقیہ داستانیں پڑھی ہوں گی تو آپ کو پتہ ہوگا کہ عشق کرنا۔ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس سے بدتر کوئی کام نہیں میری حالت عشق شروع ہوتے ہی بگڑنے لگتی ہے۔ میں فوراً جذباتی سا ہو جاتا ہوں۔ اپنی پچھلی محبتوں کو بھول جاتا ہوں اور جس سے محبت کرتا ہوں اسے اپنی پہلی محبت سمجھنے لگتا ہوں یعنی دل و جان سے فدا ہو جاتا ہوں۔ اُلٹے سیدھے وعدے کرتا ہوں۔ اگر میں نے اپنے آپ کو شادی شُدہ ظاہر کیا ہے تو میں فوراً اپنی محبوبہ سے کہہ دیتا ہوں کہ میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔ اور تمھارے ساتھ شادی کروں گا۔ تیاگ اور قُربانی کے اس جذ[illegible]بے سے متاثر ہو کر محبوبہ بڑی آسانی سے میرے جھانسے میں آجاتی ہے اور میری گرویدہ ہو جاتی ہے۔ جہاں تک میرے دوسرے چھوٹے موٹے وعدوں کا تعلق ہے۔ مثلاً مقررہ وقت پر ملنا۔ سینما جانا۔ کسی ریستوران میں جانا یا کھانا کھلانا۔ ان تمام وعدوں کو بڑے سلیقے سے نبھاتا ہوں۔۔۔

محبوبہ کو خوش کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ مشہور کوکا پنڈت کے نسخے تو آپ نے آزمائے ہوں گے۔ میرے ایک دو نسخے آزمائیے۔ اس سے فائدہ ہی ہوگا۔ نقصان کی آمد کم ہے

سب سے بہترین حربہ جس سے محبوبہ کو اپنایا جاسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہو۔ اسے کہنے دو۔ وہ تمھارے پاس بیٹھی ہو۔ تو یوں سمجھو کہ وہ تم سے بہت دور بیٹھی ہے۔ یعنی وہ خود قریب آئے۔ تُم خود قریب نہ جاؤ۔ صاف ظاہر ہے کہ اس چکر میں قوتِ برداشت کی سخت ضرورت ہے۔ یوں تو قوتِ برداشت کے بغیر کوئی بڑا اور اہم کام ہو ہی نہیں سکتا۔ دُنیا کے شہرت یافتہ اور بڑے انسانوں کی زندگیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب میں قوتِ برداشت کا مادہ سب سے زیادہ تھا۔ محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے اگر

اس شکتی سے کام لیا جائے تو کیا قباحت ہے ۔ ایک بار جب آپ کی ہونے والی محبوبہ نے خود اپنی زبانِ مُبارک سے یہ الفاظ کہہ دے گی ۔ "ڈارلنگ میں تم سے محبت کرتی ہوں ہوں" تو فتح آپ کی جناب ۔ اگر کسی وجہ سے آپ کی محبوبہ شرم اور لاج کی دیوی ہے اور وہ صرف اشاروں اور کنایوں سے اس جذبے کا اظہار کرتی ہے ۔ تو اس وقت آپ سمجھ لیجئے کہ آل کلیئر کا سگنل مل گیا ۔ اب آپ اپنی محبت کا اظہار کر سکتے ہیں ۔ سنٹ پرسنٹ جیت آپ کی ہوگی ۔ اس طرح آپ رسوائی اور بے عزّتی سے بچ جائیں گے ۔

دراصل میں راہ سے بے راہ ہو گیا ۔ یعنی میں اپنے عشق کا قصہ سُنا رہا تھا کہ بیچ میں لڑکیوں کو اپنانے کا طریقہ بتانے لگا ۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ آخری عشق کر کے میں نے قسم کھائی تھی کہ اب دوبارہ اس نامراد بیمار ~~عشق~~ کا مُنہ نہ دیکھوں گا ۔ کہ ایک دن اچانک ایک ماہ لقا سے ٹکر لگتے ہی میرا چکر شروع ہو گیا ۔ یعنی اس کے سرو قد ، گوری رنگت اور چہرے کے خدو خال سے اتنا متاثر اور مرعوب ہوا کہ دُنیا و ما فیہا کو بھول گیا ۔ گو عشق کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں اس کی طرف رجوع نہ ہوا تھا بلکہ وہ میری طرف رجوع ہوئی تھی ۔

محبوبہ کا میری طرف رجوع ہونا خطرے سے خالی نہ تھا ۔ یوں بھی اس عمر میں عشق کرنا موت کو دعوت دینا ہے ۔ میں جانتا تھا کہ عشق کے شروع ہوتے ہی میرے دل کی رفتار یوں تیز ہوگی جیسے میں کسی راکٹ پر سوار ہوں اور جلد ہی کسی چاند پر اترنے والا ہوں ۔ عشق میں صرف دل کی دھڑکنیں ہی تیز نہیں ہوتیں بھوک بھی مرجاتی ہے ۔ راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے ۔ کسی دوسرے سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا ۔ ہمیشہ اس بات کی خواہش رہتی ہے کہ محبوبہ آپ کے سامنے بیٹھی رہے ۔ کسی رقیب روسیاہ سے بات نہ کرے ۔ کسی دوسرے کی طرف نہ دیکھے ۔ بس اسی قسم کی جاہلانہ حرکتیں کرنے پر انسان مجبور ہو جاتا ہے ۔ عشق کی آخری منزل تو بہت ہی بُری ہوتی ہے انسان پاگل سا ہو جاتا ہے ۔ بیوی کو اگر آپ کے عشق کا پتہ لگ گیا

تو مجھو جیتے جی موت کا نظارہ آنکھوں کے آگے گھومنے لگتا ہے ایک طرف بیوی کی گالیاں سُنو تو دوسری طرف محبوبہ کی آہ و زاریاں۔ کبھی بیوی آنکھیں دکھاتی ہے تو کبھی محبوبہ۔ یعنی ان دونوں کے درمیان عاشق نامراد کی وہ حالت ہوتی ہے جو آج کل ویت نام کی ہو رہی ہے۔ حضورِ انور! عشق بہت بُری بلا ہے۔ ایک بار جب اس نامراد بیماری کی لت پڑ گئی تو کمبخت پان، بیڑی، شراب، افیون، گانجا اور چرس پینے کی لت تو شاید چھوٹ جائے مگر عشق کرنے کی لت تو نہیں چھوٹتی۔

جب میری حالت بد سے بدتر ہونے لگی اور جان کے لالے پڑ گئے۔ تو میں نے اپنی ماہ لقا سے التجا کی۔ "ڈارلنگ" میری آنکھوں کے آگے موت ناچ رہی ہے۔ لبوں پر جان اٹکی ہوئی ہے۔ اگر آپ مجھے معاف کر دیں گی تو بڑی عنایت ہوگی آپ کی۔"

کیوں جی۔ آپ اتنی جلدی فیڈ اپ ہو گئے ہیں ہم سے۔ ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

میں اپنی محبوبہ سے صاف صاف کیسے کہتا کہ جانِ من۔ یہ کھیل میں کئی بار کھیل چکا ہوں۔ عشق اور محبت کی مصیبتیں کئی بار جھیل چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میرا کیا حشر ہونے والا ہے میں قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہوں۔ گیس ٹربل کا پُرانا مریض ہوں۔ دو قدم چلتا ہوں تو سانس پھولنے لگتی ہے۔ یہ ڈاکٹروں اور حکیموں اور مرغن غذاؤں کا معجزہ ہے کہ میں خوبرو اور خوش شکل نظر آتا ہوں ورنہ میں کب کا شمشان گھاٹ پہنچ جاتا۔ میری حالتِ زار پر رحم کیجئے دیوی جی اور کسی نوجوان لڑکے سے عشق کیجئے۔

مجھے نوجوان اچھے نہیں لگتے۔ حسینہ نے میرے سوال کا جواب فوراً دیا۔

اس مُنہ توڑ جواب کو سُن کر میں سن ہوگیا۔ کیسا زمانہ آیا ہے جناب۔ کیسی وبا چلی ہے کہ جوان لڑکیاں نوجوانوں سے عشق کرنا نہیں چاہتیں۔ مغرب سے لے کر مشرق تک، یعنی دُنیا کے ہر دیش میں اس نئی بیماری کو فروغ ملا ہے۔ یعنی جب سے جان کینیڈی کی بیوہ نے اس راہ کو

اپنایا ہے نوجوان لڑکیاں بڈھوں کو اپنانے کی بھرپور کوشش میں مصروف نظر آتی ہیں ۔ اور یہ کوشش ایک منظم تحریک کی صورت اختیار کر رہی ہے ۔ مجھے تو اس تحریک میں ایک گہری سازش کا پتہ چلتا ہے ۔ نوجوان لڑکیوں کی ایک بہت ہی سلجھی ہوئی اور ترقی پسندانہ سیاسی چال ہے مردوں کو ہوشیار رہنا چاہیئے ۔ ورنہ جس دُنیا پر ان کی حکومت ہے وہ ہاتھ سے نکل جائے گی لیجئے میں اصلی موضوع کی طرف آتا ہوں ۔ اپنا قصہ سناتا ہوں ۔ میں نے اپنی محبوبہ سے کہا تھا کہ تمہارا عاشق کوئی مالدار آسامی نہیں بلکہ ایک غریب ادیب ہے جسے بنکوں کو نیشنلائز کرنے کے بعد بھی اس فہرست میں شامل نہیں کیا گیا جنھیں حکومت قرضہ دے گی ۔ یعنی ایک رکشہ والا سے لے کر ایک موچی تک کو حکومت قرضہ دے گی مگر بیچارے ادیب کو اس قابل بھی نہ سمجھا گیا کہ اسے قرضہ دیا جائے ۔ بہرحال جب میری محبوبہ کو میری اقتصادی حالت کا پتہ چلا تو وہ ٹس سے مس نہ ہوئی ۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اور وہ لمبی لمبی آہیں بھی بھرنے لگی اور کہنے لگی ۔ کیا آپ میرے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں کہ میں آپ کے بینک بیلنس پر نظر رکھتی ہوں یا میں آپ کو مالدار آسامی سمجھ کر عشق فرما رہی ہوں ۔ جی نہیں ۔ میں دل و جان سے آپ کو چاہتی ہوں ۔ میں اس جنم میں ہی کیا ۔ اگلے جنم میں بھی آپ کی ہو کے رہوں گی ۔

پھوٹ گئی ری قسمت ہماری ۔ یہ جواب سُن کر میں سُن سا ہو گیا ۔ اب تو مجھے پکا یقین ہو گیا کہ میرا کوئی قصور نہیں ۔ اس لڑکی کے دماغ میں ضرور کوئی فتور ہے ۔ اب آپ ہی بتایئے ۔ حضور ۔ میں کیا کرتا ۔ کاش میں پرماتما ہوتا ۔ یا میرے سینے میں گوشت اور پوست کے لوتھڑے کی جگہ سیمنٹ کا دل ہوتا تو ان آہوں ، سسکیوں اور آنسوؤں کو نظر انداز کر دیتا ۔ بس کیا عرض کروں کہ بندہ ناچیز اور کندہ ناتراش انسان کیا کرتا ۔ اس عشق کے چکر میں ایسا پھنسا کہ حالات دگرگوں ہونے لگے ۔

عشق کے کئی درجے ہوتے ہیں ۔ شروع میں محض رسمی ملاقاتیں ۔ بات سے بات بنتی اور بڑھتی ہے ۔ ہر روز ملنے کا وعدہ ، انتظار ، محبت کا اظہار ۔ اور ساتھ ہی ہلکا سا بخار

پھر وصل کا وعدہ۔ پھر ہجر کا رنگ گہرا ہونے لگتا ہے۔ پھر ایک اسٹیج ایسی بھی آتی ہے خُدا ایسی اسٹیج کبھی نہ لائے۔ جب عاشق معشوق ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ آخری اسٹیج کو تجربے کار عاشق بڑی تیزی آسانی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ ناتجربہ کار عاشق تو اس منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس سے پہلے ہی راہی ملک عدم ہوتے ہیں۔

ہاں جب ہجر کی اسٹیج شروع ہوتی ہے تو عاشق کا اصلی امتحان شروع ہوتا ہے۔ ہجر اور فراق کی گھڑیاں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے عاشقوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ انہی لمحات میں اکثر عاشق گریبان چاک کر کے مجنوں بن جاتے ہیں۔ صحرا صحرا جنگل جنگل گھومنے لگتے ہیں۔ ماڈرن مجنوں اپنی جان بچانے کے لئے نرسنگ ہوم یا شفاخانے کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ کئی ایک اونچی بلڈنگوں سے چھلانگ مار کر زندگی ختم کر دیتے ہیں یا سمندر، دریا، کنواں میں چھلانگ لگا کر اگلے جہان کا رُخ کرتے ہیں۔ یوں آج کل کے عاشق اتنی دوڑ دھوپ نہیں کرتے، بڑے آرام اور چین سے مرنا چاہتے ہیں وہ بیچارے نیند آور گولیوں کو کھا کر سو جاتے ہیں اور دوبارہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ یہ مرنے کا بہترین طریقہ ہے اور اس میں تکلیف کم ہوتی ہے۔ مرنے میں بڑا مزا آتا ہے اس لئے اس طریقے نے ایک وبائی صورت اختیار کر لی ہے۔ جس کی روک تھام بھارتی سرکار کو کرنا چاہیے۔

چوں کہ میں درجنوں عشق کر چکا ہوں اس لئے میں خودکشی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ میری قوتِ برداشت تو میری محبوبہ آزما چکی تھی اب میں اپنی محبوبہ کی سہن شکتی کو آزما رہا تھا۔ آخر کب تک وہ اس طرح عشق کرتی رہے گی۔

ایک شام جب ہم دونوں سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے لہروں کو گن رہے تھے کہ میری محبوبہ نے کہا۔ ”جس کمرے میں آپ رہتے ہیں کیا وہ کمرہ آپ ہی کا ہے؟!“

”کمرہ تو مالک مکان کا ہے، لیکن رہتا میں ہوں اور کمرہ میرے نام پر ضرور ہے۔“

"پیرماتما کرے۔ اگر آپ مر جائیں، تو یہ کمرہ کس کے نام کریں گے آپ؟"
میں اپنی محبوبہ کی طرف دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب میری محبوبہ کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ اور وہ اپنی اصلی اوقات پر آ گئی تھی۔ گو سوال سے کافی ذہانت ٹپکتی تھی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ بمبئی میں نوکری اور چھوکری تو بڑی آسانی سے مل جاتی ہے مگر رہنے کے لئے دو گز زمین نہیں ملتی۔

اس شام میں چپ رہا۔ ہم دونوں سمندر کی لہریں گنتے رہے۔
کل جواب دوں گا۔ ڈارلنگ۔ کل اسی جگہ ملیں گے۔"
یہ کہہ کر میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

رات بھر سوچتا رہا۔ میری پریمیکا کافی ذہین ہے۔ میں آج تک اسے جاہل اور بے وقوف سمجھتا رہا۔ دراصل جہاں وہ رہتی ہے وہ جگہ بے حد گندی، گھٹیا اور چھوٹی ہے۔ میرا کمرہ کافی کشادہ، صاف ستھرا اور ہوادار ہے اور اب میری محبوبہ کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ بڈھا زیادہ عرصہ تک جی نہیں سکتا۔ عشق جیسی نامراد بیماری اسے مار کر دم لے گی۔ مرنے سے پہلے اگر یہ بڈھا یہ کمرہ اس کے نام کر دے تو پو بارہ۔ یعنی۔ میری محبوبہ کی نظر میری کمر پر نہ تھی میرے کمرے پر تھی۔
اگلی شام میں سمندر کے کنارے نہ گیا۔ کیوں کہ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ مجھے صرف ایک دو ماہ یا ایک دو سال ہی نہیں جینا ہے بلکہ دس پندرہ سال اور زندہ رہنا ہے۔ اس کے بعد میری محبوبہ کے کئی پیام آئے۔ کئی خط آئے۔ لیکن میں نے اپنی محبوبہ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میری محبوبہ کو میری بے رخی سے اندازہ ہو گیا کہ یہ چالاک اور کائیاں بڈھا اتنی آسانی سے نہ تو مرے گا اور نہ ہی اپنا کمرہ اس کے نام کرے گا۔ اس لئے وہ بھی کسی اور طرف رجوع ہو گئی۔
اب میں نے قسم کھائی ہے کہ میں اپنے کمرے میں مرنا چاہتا ہوں کسی فٹ پاتھ پر نہیں۔ اس لئے اب میں نے توبہ کر لی ہے کہ آئندہ عشق نہیں کروں گا۔

ہم نے کار خریدی

وہ مثل تو آپ نے سُنی ہوگی کہ خدا کسی کو جب دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ہمیں بھی خدا نے روپیہ اور مرتبہ اسی طرح دیا۔ یوں تو فلمی دُنیا میں ہم ہاتھ دیکھنے آئے تھے۔ لیکن چند برس کے بعد ہم دوسروں کو ہاتھ دکھانے لگے۔ ایک اچھے خاصے مشہور اور امیر ایکٹر ہمارے جال میں ایسے پھنسے کہ بس ہمارے مُرید ہو کر رہ گئے۔ دراصل وہ تھے کافی ذہین اور قابل اور ہم تھے نہایت بے تُکے اور نااہل۔ اکثر ذہین آدمی نااہل آدمیوں کی صحبت زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ ذہانت کی داد زیادہ تر جاہلوں سے ملا کرتی ہے۔

قصّہ مختصر یہ کہ وہ ایکٹر جس کا نام میں ابھی نہیں بتانا چاہتا، ہماری جوتش کی سوجھ بوجھ سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنا کاروبار ہمارے سپرد کر دیا۔ جس وقت انھوں نے اپنے فلمی ادارے کا کاروبار ہمیں سونپا، اس وقت وہ گھاٹے میں جا رہے تھے۔ شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ ہم ستاروں کی مدد سے ان کی ڈگمگاتی کشتی کو ڈوبنے سے بچا لیں گے۔ لیکن انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ جس شخص کے وہ یہ کام سپرد کر رہے تھے اس کی اپنی کشتی کب کی ڈوب چکی تھی۔ اب ہمارے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ ہم ان کی کشتی کو مکمل طور پر ڈبو کر اپنی کشتی کو پار لگا لیں۔ بس جناب ستاروں نے ہمارا ساتھ دیا۔ ہماری سوئی ہوئی ذہانت اُبھر آئی۔ اور ہم نے ان پر ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیئے۔ ان کی اچھی خاصی فلم کمپنی اپنے نام کرالی۔ اب

ہماری نظران کی کار پر تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کار ایک سندھی فنانسر کے پاس بیس ہزار روپوں میں گروی تھی۔ میرے دوست فرمانے لگے، آپ کار لے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ بیس ہزار روپے ادا کردیں۔" دراصل ہم اس کار پر بُری طرح فدا تھے۔ عورت اور کار میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اگر ایک بار ان دونوں میں سے کسی پر دل آجائے۔ تو اسے اپنا بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ یہ بیس ہزار روپے بھی اس کاٹھ کے اُلّو کی جیب ہی سے نکالے جائیں۔ لیکن کوشش کرنے پر معلوم ہوا کہ ایکٹر صاحب جلد ہی پبلک سیکٹر میں جانے والے ہیں۔ جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو ہوش و حواس اڑجاتے ہیں۔ اور یوں بھی ہماری اقتصادی حالت آج کل بہت بہتر تھی۔ اس لئے ہمارے اندر رحم دلی اور انسان دوستی کی لہر اُبھر آئی۔ اور ہم نے اپنے کلیجے پر پتّھر رکھ کر بیس ہزار اس سندھی مہاجن کے حوالے کردیئے اور کار خریدلی۔

دراصل کار ایک ایسی شئے ہے جو انسان کو اچھا خاصا بے کار بنادیتی ہے۔ ہم کار لیکر جب گھر پہنچے تو محلّے کے لوگوں نے ہمیں گھورنا شروع کردیا۔ اور جب ہم کار سے نیچے اُترے تو محلّے کا ہر شخص ہمیں یوں دیکھ رہا تھا، جیسے ہم کسی کا خون کرکے آئے تھے ـــــ حالاں کہ ہم نے صرف اپنے بیس ہزار روپوں کا خون کیا تھا۔

یوں ایک خوبصورت کار اور داشتہ میں فرق نہیں ہوتا ـــــ جیسے داشتہ پر بے تحاشہ روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور اس کے تجربے برداشت کرنا پڑتے ہیں، اسی طرح کار کی دیکھ بھال میں پورا وقت اور کافی روپے خرچ کرنے ضروری ہوجاتے ہیں۔ داشتہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اپنے پُرانے عاشق کو چھوڑ سکتی ہے۔ اسی طرح کار بھی کسی بھی وقت کسی بھی جگہ فیل ہوسکتی ہے۔

دیکھنے میں ہماری کار بڑی خوب صورت تھی ـــــ اس کی لمبی چوڑی باڈی اور ظاہری چمک دمک سے ہماری آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں اور دُشمنوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ کار کی لمبائی چوڑائی ہمارے فلیٹ سے بھی بڑی تھی۔ ہم نے پہلے ہی دن اپنی جلد بازی

کھڑکی کے قریب بچھوائی، تاکہ آنکھ کھلتے ہی ہماری نظر سب سے پہلے اپنی نئی نویلی کار پر پڑے ۔ کار رکھنے کے لئے ہمارے پاس گیرج نہ تھا اس لئے ہمیں اپنی کار کو کھلے میدان میں رکھنا پڑا ۔ رات بھر ہمیں صرف اس اندیشے سے نیند نہ آئی کہ رات کو محلّے کے لونڈے کار کے شیشے نہ توڑ دیں یا مڈگارڈ نکال کر چور بازار میں نہ بیچ دیں ۔

رات جیسے جاگ جاگ کر کاٹ لی ۔ صبح سویرے ڈرائیور آدھمکا ۔ اور ہمیں کار میں اسٹو ڈیو لے گیا ۔ جس طرح داشتہ کی اماں جان کا احترام واجب ہوتا ہے اور ان کی بات ماننی پڑتی ہے ، اسی طرح آپ کار کے ڈرائیور کو ناراض نہیں کر سکتے ، کیوں کہ کم بخت کسی بھی جگہ کار کو بے کار بنا سکتا ہے دراصل کار خریدنے کے بعد ہم نے سوچا یہ تھا کہ ہماری تکلیفوں میں اضافہ نہ ہوگا ۔ بلکہ کمی ہوگی ، یار دوستوں پہ رعب پڑے گا ، بیوی آگے پیچھے گھومے گی ، اور ہماری بزنس میں ترقی ہوگی ۔ لیکن یہاں تو یار دوستوں نے کار دیکھتے ہی منہ پھیر لیا ۔ کتنوں نے تو صاف صاف یہ تک کہہ دیا " اخاہ ! آخر آپ نے اپنے محسن کی کار بھی ہتھیا لی ! مان گئے گرو ـــــ آخر دوست کو لنگوٹی بندھوا دی نا ! "

بیوی کو مجھ پر پہلے ہی شک تھا کہ میں باہر کسی لڑکی سے عشق فرماتا ہوں ۔ اب وہ کار کو بھی سوکن سمجھنے لگی ۔ کہنے لگی " پہلے ہی کہاں گھر میں ٹکتے تھے جواب ٹھیرو گے ۔ اب تو چار پہیوں والی کھٹیا مل گئی ۔ دن رات اسی پر سوار رہو ۔ پرماتما کرے پنچر ہو جائیں چاروں ٹائر ۔ تب کہیں جاکر میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا "

ہمارے باپ دادا کی یہ حالت تھی کہ ان بے چاروں کو کار دیکھنا تک نصیب نہ ہوئی اُدھر ہماری حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ ہم نے کار تو خرید لی ۔ لیکن خریدنے سے پہلے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ نیک بخت ایک گیلن میں دوڑے گی کتنے میل ؟ جب ڈرائیور نے تقریباً ہر میل پر ایک گیلن پٹرول ڈلوانا شروع کیا تو ہمیں معلوم ہوا کہ ایک گیلن میں مہم صاحب صرف سات میل چلتی ہیں ۔ اب پٹرول کے علاوہ ہمیں کیا معلوم تھا کہ اس نخریلی کار کے اور بھی اخراجات ہوں گے یعنی

اس کے کل پُرزے بھی خراب ہو سکتے ہیں۔ آئے دن کبھی بریک خراب ہو جاتے ہیں، کبھی کلچ ٹوٹ جاتا، کبھی پٹرول کی ٹنکی لیک کرنے لگتی، کبھی آگے کی لائٹ فیل ہو جاتی کبھی پیچھے کی، کبھی آگے کا ٹائر پنچر ہو جاتا۔ بارش کے دنوں میں اور مصیبت تھی ــــ یعنی ساری کار کو دھلوایئے، اور ڈرائیور نہ آئے تو خود پانی سے دھویئے اور کپڑے سے پونچھئے۔ بس صاحب کیا عرض کروں، کس قسم پیشہ کے چنگل میں پھنس گیا ــــ یہ نگوڑی کار تو اچھے خاصے کھاتے پیتے انسان کا دیوالہ نکال دیتی ہے۔

یار دوستوں کو کیا سوجھی کہ ہر دوسرے تیسرے دن کار مانگ کرلے جاتے۔ اب آپ ہی بتایئے پٹرول کے بغیر تو آپ کار نہیں بھیج سکتے۔ ہماری کار میں دس پندرہ گیلن سے کم پٹرول نہیں آتا۔ اور جب تک اتنا پٹرول نہ ڈلوایا جائے ہماری کار سرکتی ہی نہیں ــــ ایک بار تو اپنی عزت بچانے کے لئے ہمیں اپنے گھر کا اسٹوو بھی بیچنا پڑا۔ تاکہ کار میں پٹرول ڈلوا کے اسے ایک عزیز دوست کے گھر بھجوایا جا سکے۔

چند مہینوں کے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ اگر یہ کار چند مہینے اور ہمارے پاس رہی تو کھانے کے لالے پڑ جائیں گے اپنی رہی سہی عزت چلی جائے گی اور فاقے بھی کرنے پڑیں گے۔

اگر ڈرائیور کو تنخواہ وقت پر ملتی تو کار شان سے سڑکوں پر دندناتی پھرتی۔ لیکن جہاں اسے تنخواہ دینے میں تین چار دن کی دیر ہوئی کہ کار کے پُرزے خراب ہونے لگتے۔ بس ہمارا ڈرائیور کار میں کوئی نہ کوئی نقص بتا کر روز کے دس پانچ روپے اینٹھ لیتا۔ اور کار کو 'ٹھیک' کراتا رہتا۔ ہم ایک نکمّے آدمی کی طرح مونہہ دیکھتے رہ جاتے۔ اور خدا سے دُعا کرتے دولت عطا کر یا اس کار سے چھٹکارا دے ......

ہوتے ہوتے اس کار کے چلانے میں ہماری حالت ایسی دگرگوں ہوئی کہ بیوی کے گہنے تک بک گئے۔ گھر کا سامان گروی رکھ دیا گیا ڈرائیور نے تنخواہ نہ ملنے پر گالیاں دینی شروع کر دیں۔ بھائی بہنوں نے گھر آنا چھوڑ دیا۔ دوستوں نے اپنی کاروں میں لفٹ دینا بند کر دیا۔ کہتے "چلنے دو ٹھگ کو پیدل۔ ذرا اسے اپنی اوقات تو معلوم ہو جائے ......"

خدا جنّت نصیب کرے اس نیک دل ٹرک ڈرائیور کو، جس نے ہمارے حال پر ترس کھا کر ہمیں نئی زندگی بخشی۔ اگر وہ ٹکر مار کر بھاگ نہ جاتا تو ہم اسے گلے سے لگا لیتے اور کہتے۔ "میرے عظیم محسن زندگی بھر تمھارا احسان نہیں بھولوں گا"۔ کم بخت نے کیا ٹکر ماری تھی کار کے دونوں دروازے یوں آپس میں بغل گیر ہوئے جیسے برسوں کے بچھڑے دوست گلے ملتے ہیں۔ ہم چوں کہ پچھلی سیٹ پر براجمان تھے اس لئے بچ گئے۔ خدا ایک بار اور جنّت نصیب کرے اس ٹرک ڈرائیور کو جس کی وجہ سے ہمارا ڈرائیور ایسا زخمی ہوا کہ ابھی تک ہسپتال میں پڑا کراہ رہا ہے، اور تین ماہ تک وہ اُٹھنے کے قابل نہیں —— کم از کم تین ماہ تک تو وہ تنخواہ مانگنے نہیں آئے گا۔

سب سے زیادہ خوشی تو ہمیں اس بات سے ہوئی کہ ہماری کار اسٹوڈیو کے شیڈ میں کھڑی ہے۔ ہم ہر روز آتے جاتے اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ لیتے ہیں اور پھر خدا کا شکر بجالاتے ہیں کہ بڑے اچھے وقت پر اس کار سے پیچھا چھوٹا، نہیں تو یہ کار ہمیشہ کے لئے ہمیں بیکار بنا دیتی۔ ہم تو مرنے سے پہلے وصیت کر جائیں گے کہ دس شادی کر لیجیے لیکن کار کبھی نہ خریدیئے۔